

روحِ عذابِ قبر اور سماعِ موتی

مختلف مکاتب فکر کے معترضین کے دلائل کا مکمل و مدلل جائزہ

تصنیف

مولانا عبدالرحمن کیلانی

مکتبۃ السلام
کتاب فروش پور لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

*** توجہ فرمائیں ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب۔۔۔

* عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

* مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ [UPLOAD] کی جاتی ہیں۔

* متعلقہ ناشرین کی تحریری اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

* دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

**** تنبیہ ****

**** کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب کسی بھی الیکٹرانک کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔**

**** ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔**

نشر و اشاعت اور کتب کے استعمال سے متعلق کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں :

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.kitabosunnat.com

روحِ عذابِ قبر و سماعِ موتی

مختلف مکات فکر کے معترضین کے دلائل کا
مُحکم و مدلل جائزہ

از قلم:

مولانا عبد الرحمن کیلانی

ناشر

مکتبہ السَّالِحِیْنَ دس پورہ
گلی نمبر ۲ لاہور



حکمہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: روح عزاب قبر
مصنف: مولانا عبد الرحمان کیلانی
اشاعت چہارم: مارچ 2005
تعداد: 2200
زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی
زیر اہتمام: نجیب الرحمان کیلانی فون: 7844157
ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی - انجینئر حافظ شفیق الرحمان کیلانی
مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت: 35 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام سٹریٹ نمبر 20، وکن پورہ لاہور

فون: 7844157-7280943

دوسری سیر

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیو یارک



ہیڈ آفس و مرکزی شوزوم 36 - لوزنال، میکسٹرٹ شاپ لاہور

فون: 711 1023, 711 0081, 723 2400, 724 0024 فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوزوم اردو بازار افراسنہ، مغربی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مرتب نہیں کی گئی، بلکہ یہ میرے ان پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تین سالوں میں ماہنامہ ترجمان الحدیث اور ماہنامہ محدث میں بالاقساط شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کا اصل موضوع وہی تھا جو کتاب کے نام سے واضح ہے۔ اس موضوع کی اہمیت جتنی کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ یا کوئی طبقہ نہ ہوگا جو اس موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ ان مسائل میں کچھ لوگ اگر افراط کی راہ پر چل نکلے اور انتہا کو جا پہنچے تو کچھ دوسرے تفریط کی طرف مائل ہوتے اور دوسری انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ ان حالات میں یہ مضامین ہر طبقہ میں خاصی دلچسپی سے پڑھے گئے اور اب اسی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مختلف اوقات میں چھپنے والے ان مضامین کو یک جا کرنے سے کتاب بڑا میں بعض تقاضات پر تکرار واقع ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح کے تکرار کو دور کر دیا جائے مگر اس معاملہ میں مجھے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ایک مقام پر کسی بات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے تو دوسرے مقام پر ذرا تفصیل سے پھر مضمون کی مناسبت بھی اس بات کی متقاضی تھی۔ لہذا اجمال اور تفصیل دونوں اپنے اپنے مقام

پر درست اور ضروری معلوم ہوئے۔ لہذا اسے جوں کا توں رہتے دیا گیا ہے۔
پھر اس تکرار کا بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ بعض ضروری باتیں تکرار کی وجہ سے
ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء یوں ہوئی، جن دنوں وحدت الوجود، وحدت الشہود وغیرہ سے
متعلق میرے مضامین ”ترجمان الحدیث“ میں چھپ رہے تھے اور ان میں ضمناً روح
اور بندوں کے مسئلہ تنازع کا ذکر بھی آگیا، تو ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب
نے روح اور تنازع سے متعلق چند سوالات لکھ بھیجے جن کا جواب میں نے ذرا تفصیل
سے لکھا اور یہ جواب ”الاستفتاء“ کے عنوان کے تحت ”ترجمان الحدیث“ کی اشاعت
ستمبر ۱۹۸۲ء میں چھپا۔ اب اس استفتاء پر مزید دو حضرات جناب عبدالقادر صاحب
سومرد، کراچی اور محمد احسان الحق صاحب، یاروشیل۔ میانوالی کی طرف سے سوالنامے
آئے جن میں ان کے تفصیلی جواب کے متعلق لکھا گیا تھا۔

ان سوالات کے جواب میں میں نے ایک طویل مقالہ لکھا، جو کافی عرصہ بعد
ماہنامہ ”محدث“ کی دو سطحوں دسمبر ۱۹۸۳ء اور جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا خیال
یہ تھا کہ یہ طویل مقالہ لکھنے کے بعد شاید مزید استفسارات کی ضرورت باقی نہ رہے گی
وجہ یہ تھی کہ ان سوالناموں میں میرے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جب
قرآن میں صرف دو بار کی موت اور دو بار کی زندگی ہی کا ذکر ہے تو اس عرصہ موت
میں برزخ کی زندگی کہاں سے آگئی جو اس قدر مشہور ہے؟ اور اس سوال کا جواب
کافی تفصیل سے لکھ دیا گیا تھا۔ اسی ضمن میں عذاب قبر اور سماع موتی کے مسائل بھی
زیر بحث آئے۔

اس مقالہ کے رد عمل کے طور پر تین طرح سے اظہار خیال کیا گیا۔ ایک

طبقہ نے کہا کہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کو خواہ مخواہ صوفیاء کے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے
اور نیز یہ کہ کتاب الروح امام ابن تیمیہ کی اپنی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ کبھی
دوسرے نے تصنیف کر کے اسے امام ابن قیم سے چسپاں کر دیا ہے۔ دوسرا
طبقہ وہ ہے جو اس مقالہ کی روش اعتدال پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے تقاضا کیا
کہ اس مقالہ کو پمفلٹ کی صورت میں الٹک چھاپ کر شائع کرنا اور عوام میں

مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ جبکہ تیسرے طبقہ اس قدر تشدد ہے کہ وہ سماع موٹی کے سلسلہ میں کسی بھی استثنائی صورت کو برداشت نہیں کرتا۔ اور میں نے اس استثنائی صورت کے سلسلہ میں جو چند احادیث صحیحہ پیش کی تھیں، ان میں سے کسی روایت کو تو مجرد یا موضوع ثابت کیا اور جن روایات میں ایسی گنجائش نظر نہ آئی ان کی تاویل کر کے قرآن کریم کے اس واضح ارشاد ”کہ مرعے سن نہیں سکتے“ کے مطابق ڈھال لیا اور استثنائی صورت کو ختم کر دیا۔ اور اس مطابقت کی صورت یہ پیش کی کہ قبر سے مراد یہ زمینی یا مادی یا حتیٰ قبر یا زمینی گڑھا ہے ہی نہیں۔ بلکہ قبر کے حقیقی معنی وہ برزخی قبر ہے جو برزخی زندگی یا مرحلہ میں روحوں کا مستقر ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط بھی موصول ہوئے۔ ان میں سے نبشاً مختصر خط جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب (ص ب ۲۵۵۸- مدینہ منورہ) کا ہے، انہوں نے چند حوالوں کے ساتھ میری توجہ اس طرف دلائی ہے کہ میں نے علامہ وحید الزمان کی تصنیف ”لغات الحدیث“ کے حوالہ سے جو حدیث ”حُلِّدٌ وَاشْطَرَدْنِي كَهْفِي الْحُمَيْرَاءُ“ درج کی تھی۔ وہ موضوع ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ وضاحت فرمائی۔ تاہم یہ حدیث صرف تائید کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ لہذا اس حدیث کے موضوع قرار پانے کے بعد بھی موقف میں فرق نہیں پڑتا۔ علامہ کو کے حوالہ سے ایک ہی حدیث درج کی تھی وہ بھی موضوع نکلی۔ لہذا اسے کتاب ہذا سے خارج کر دیا گیا ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل تھے۔ اور یہ اس تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سماع موٹی کے بارے میں کسی طرح بھی استثناء کے قائل نہیں۔ اس کے بجائے وہ برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم جیسے نظریات کے قائل ہیں۔ ان نظریات کے موجد۔ جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے۔ ڈاکٹر کیسٹن مسعود عثمانی صاحب (توحید روڈ۔ کیمارٹی کراچی) ہیں۔ میں نے اپنے تیسرے مضمون بعنوان ”برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف“ میں ان دونوں حضرات کے اختلافات، اعتراضات اور اشکالات کے حتیٰ المقدور تفصیل سے جوابات کہے۔

چوتھا مضمون لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب موصوف کے ایک متشدد پیر و کار۔ جناب اشفاق صاحب (ناظم آباء و اجداد) نے مجھے نہایت تند و تیز لہجہ میں ایک طویل خط لکھا اور مجھے سخت کسبست کسنے کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ التماس کی گئی تھی کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا بنظر غائر کٹر پیچہ پڑھ کر اپنے نظریات پر نظر ثانی کروں۔ لہذا اب میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کے نظریات اور دلائل کا تجزیہ پیش کروں۔ چنانچہ چوتھا مضمون "ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ" اسی نہیں منظر میں سپردِ قلم ہوا اور ساتھ ہی اشفاق صاحب کا خط بھی بعینہ شائع کر دیا گیا۔ یہ خط اور اس کا جواب دو قسطوں میں شائع ہوئے۔

ان حضرات کی خط و کتابت سے فراغت ہوئی تو جناب چودھری محمد علی صاحب خفگی کا ایک طویل ترین خط بصورت مضمون موصول ہوا۔ تحریر کا انداز اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ یہ مضمون چودھری صاحب کے بجائے کسی متاثر عالم دین کا ہی ہو سکتا ہے جنہوں نے چودھری صاحب کی آڑ لے کر اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام تر مضمون نبی سیاحی سے اور رواں دواں شکستہ خط میں تحریر تھا جبکہ نیچے چودھری صاحب کے دستخط اور پتہ کالی سیاحی سے نسبتاً باریک قلم سے اور ناہیجہ خط شکستہ میں ثبت تھے۔ جو کچھ بھی تھا، مجھے تو بہر حال جواب دینے سے غرض ہے۔ چودھری صاحب موصوف صرف سماع موٹی پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ اس کے جواز کو بنیاد بنا کر اس سے بعد از مرگ اولیاء اللہ کی کرامات اور تصرف فی الاُمور پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اس خط یا مضمون میں سماع موٹی کے علی الاطلاق جواز کو قرآن، حدیث، اقوال صحابہ اور بزرگوں کے اقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں یہ استدعا بھی کی گئی ہے کہ میرے اس خط یا مضمون "سماع موٹی" تصویر کا دوسرا رخ" کو وسعت قلبی سے کام لیتے ہوئے بحسنہ محدث میں شائع کر دیا جائے اور اس مسئلہ کا فیصلہ قارئین کرام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

اگرچہ یہ خط یا مضمون بہت طویل تھا، تاہم چودھری صاحب کی خواہش کا

احترام کرتے ہوئے یہ خط پورے کا پورا شائع کر دیا گیا اور میرا جواب اس صورت میں ہے۔ کہ صفحہ میں لائن کے اوپر تو چودھری صاحب کا مضمون مسلسل چل رہا ہے اور لائن کے نیچے حواشی کی طرز پر میرے جوابات مسلسل چلتے ہیں۔ اگر کسی صفحہ پر لائن نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مواد چودھری صاحب کا ہے۔ یہ صورت محض اختصار کی خاطر اختیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون بعد جوابات محدث کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔ کتاب نما میں اس پانچویں مضمون کا عنوان "سابع موتی سے تصرفات اولیاء اللہ تک" تجویز کیا گیا ہے۔

ان مضامین کے بالا اقساط اور مختلف ادوار میں چھپنے سے یہ فائدہ ضرور ہو گیا ہے کہ میرے بیان سے اختلاف رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو اختلاف و اعتراض کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور اسی طرح مجھے ان حضرات کو جواب دینے کا۔ اس طرح اس موضوع کے تمام تر پہلو سامنے آ گئے، جو ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی صورت میں شاید نہ آسکتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی تاویلات کے بھندے سے بچائے اور شریعت کا سیدھا سادا اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین

عبد الرحمن کیلانی۔ دارالسلام۔ وسن پور لاہور
شوال ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۹	دوسرا مرحلہ دنیوی زندگی	۳	پیش لفظ
"	استثنائی صورتیں	۸	فہرست مضامین
۳۰	۱۔ احیائے موتی	۱۲	① الاستقام
۳۱	ب۔ خواب	۱۳	الحجاب
۳۲	برزخ کا لغوی مفہوم	"	۱۔ امر ربی کا مفہوم
"	برزخی موت یا نیند	۱۴	۲۔ سوال روح کے ساتھی؟
"	روح انسانی یا نفس	"	۳۔ روح کی قسمیں
۳۳	روح سے متعلق چند حقائق	۱۶	۴۔ تناسخ یا آواگون
۳۵	تیسرا مرحلہ عرصہ برزخ	۱۸	روح کا سفر
"	استثنائی صورتیں	"	شہداء کی زندگی
"	۱۔ عذاب قبر	"	سماع موتی
"	عذاب قبر کی حقیقت	۱۹	۵۔ تناسخ اور روح کلی
۳۶	قرآن اور عذاب قبر	۲۱	۶۔ حالت نزع میں رخ و رخت
۳۸	قبر اور حدیث	"	۷۔ بدر و حین
۳۹	عذاب قبر کا عقلی ثبوت	"	② روح عذاب قبر اور
۳۹	عذاب قبر روح اور بدن {	۲۳	سماع موتی
"	دونوں کو ہے۔	۲۶	الحجاب
۴۰	آزمائش اور حساب کا فرق	"	زندگی اور موت کے چار مراحل
۴۲	ب۔ سماع موتی	۲۷	پہلا مرحلہ موت ہے۔
۴۳	استثنائی صورت	"	روحوں کی پیدائش کب ہوتی؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۸	علامہ وحید الزمانؒ	۴۳	استثنائی صورتوں کے نتائج
۵۹	سماعِ موثق اور مولانا مودودیؒ	۴۴	سماعِ موثق کے قائلین کا {
۶۰	سماعِ موثق کی پشت پناہی		طرز استدلال
۶۲	چوتھا مرحلہ - اخروی زندگی	۴۵	۱۔ قرآنی آیات کی تاویل
۶۲	ارواح کی بین المراحل		تاویلات کا جائزہ
۶۲	پیش رفت اور مراجعت {	۴۶	۲۔ احادیث صحیحہ
۶۳	شہداء کی زندگی		۳۔ تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث
۶۳	روحوں کی واپسی		۴۔ بزرگوں کے اقوال
	نگاہِ بازگشت		متکبرین سماعِ موثق کے دلائل
	۳۔ بزرخی قبر اور بزرخی {		۱۔ قرآن
۶۴	جسم سے نعارف {	۴۷	۲۔ احادیث صحیحہ
	مراسلات (۱)		۱۔ مقتولین بدر
۶۸	مستفسر کے دلائل کا جائزہ	۴۹	حضرت عائشہؓ کا تفقہ
۶۹	۱۔ قبر کا اصل مقام	۵۰	۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا
۷۰	۲۔ عذابِ قبر کا جسم سے تعلق		۳۔ جو توں کی چاپ سننا
۷۱	پہلی حدیث	۵۱	۴۔ حضور اکرمؐ پر صلوة و سلام
۷۱	دوسری حدیث	۵۲	سلام تشہید
۷۲	تیسری حدیث	۵۳	موضوع احادیث
۷۲	مستفسر کے دلائل کا جواب		نقد و نظر
۷۶	مستفسر کے اشکالات	۵۴	موضوع حدیث ۲
۷۷	۱۔ قبر کا معنی اور مقام	۵۵	علمائے دین اور سماعِ موثق
۷۷	۲۔ نقد احادیث	۵۶	جعلی حدیث کے نتائج
۷۹	۳۔ تاویل احادیث	۵۷	کتاب الروح اور سماعِ موثق
۸۱	ماحصل		امام ابو حنیفہؒ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۰۸	سماع موتی کے متعلق قول فیصل	۸۳	② ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ برائے (۲)
۱۰۹	نظریہ برزخی قبر کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت	۸۳	اشفاق صاحب کے عتاب نامہ
۱۱۰	⑤ سماع موتی سے تصرفات اولیاء تک	۹۰	جوابات
۱۱۱	مراسلات (۳)	۹۱	۱۔ مقام قبر؟
۱۱۱	سماع موتی تصویر کا دوسرا رخ	۹۱	برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے
۱۱۲	کیا سماع موتی کے قائل مشرک ہیں؟	۹۲	برزخی جسم
۱۱۳	بزرگوں کی مشترک اور متواتر کوششیں	۹۳	کیا یقین اور سچیں برزخی
۱۱۵	پھیلوں کا پھل پر لعن طعن ائمہ مشائخ کے اقوال کو حجت	۹۳	مقام ہیں؟
۱۱۶	سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔	۹۴	قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے
۱۱۷	قرقہ برستی کی اصل بنیاد برطانیہ جماعت یا سودا عظیم	۹۵	شائخوں والی حدیث کا نیا مطلب؟
۱۱۹	سماع موتی پر اجماع اُمت؟ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۹۶	برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط
۱۲۰	اموات کا احساس و شعور	۹۸	قبر کے عام مضمون پر عثمانی صاحب کے اعتراضات
		۱۰۰	اعتراضات کے جوابات
		۱۰۱	شہداء اور عالم برزخ
		۱۰۱	۲۔ اعادہ روح اور عذاب قبر
		۱۰۶	قد عیناً الیہ کی عثمانی تشریح
		۱۰۷	اعتراض ۱
		۱۰۷	جواب
		۱۰۷	اعتراض ۲
		۱۰۸	جواب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۲۲	نص میں اجتماع نہیں۔	۱۲۱	قرآن سے سماع موٹی کے دلائل
۱۲۳	انکار سماع موٹی سے {	۱۲۲	دلیل کا جواب
۱۲۴	حضرت عائشہؓ کا رجوع؟ {	۱۲۳	وضع حدیث اور سماع موٹی
۱۲۴	باب سماع میں حضرت عائشہؓ سے مروی روایات۔	۱۲۴	دوسری وضع حدیث
۱۲۵	ابن ابی الدنیا کی روایات	۱۲۵	تیسری وضع حدیث
۱۲۵	حضرت عائشہؓ کا اپنے بھائی سے خطاب۔	۱۲۶	بزرگوں سے غضب و عناد؟
۱۲۶	ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟	۱۲۸	من دون اللہ کی تفسیر؟
۱۲۷	فوت شدہ بزرگوں سے {	۱۳۰	معبودانِ باطل اور {
۱۲۷	عورتوں کا پردہ؟ {	۱۳۱	بزرگ ہستیاں {
۱۲۷	حیاتِ برزخ اور سماع موٹی {	۱۳۲	والتاریعات غرقا کی تفسیر
۱۲۸	کیا لازم و مفروض ہیں؟ {	۱۳۳	ترجمہ میں "نفوس فاضلہ"
۱۲۸	سماع موٹی یا {	۱۳۵	کے اضافہ کے فوائد {
۱۲۸	احترامِ آدمیت؟ {	۱۳۶	احادیث رسول اللہ سے {
۱۲۹	امام ابو حنیفہؒ سے منسوب روایات	۱۳۸	سماع موٹی کا ثبوت {
۱۵۰	مکذبین سماع موٹی کے امامِ اعظم	۱۳۹	سماع موٹی اور صحابہ کرامؓ
۱۵۱	معتمد کس کے لیے؟	۱۴۰	حدیث صحیح، استنباط غلط
			حضرت عائشہؓ کے انکار {
			سماع موٹی پر ایک نظر {



الاستفتاء

(یہ استفتاء ترجمان الحدیث ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔)

غلام رسول زائد قبولہ ضلع ساہیوال سے لکھتے ہیں:
مکرمی جناب کیلانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
تعریف خدا اور تو صیف خاتم المرسلین۔

آٹھ ماہ بعد بندہ گورنمنٹ کالج لاہور میں سال دوم کا طالب علم ہے یاہنامہ ترجمان الحدیث میں آپ کے مضامین پڑھنے کے بعد دینی طور پر آپ کے علمی استعداد کا معترف ہو گیا ہوں۔ خدا آپ کو ملت اسلامیہ کی بھرپور خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!
گزشتہ شماروں میں موجودہ شماروں تک حالاً آپ کا بصیرت افروز سلسلہ وار مضمون نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود شائع ہو رہا ہے جس سے آپ کی علمی لیاقت اور دیگر مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

اس سلسلے میں چند سوالات ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنے مخصوص انداز سے ان کا حل بیان فرمائیں گے۔ میں اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں گا۔
نزدیک یہ کیسے علم میں اضافہ کا موجب ہو گا۔ براہ راست جواب کے لیے ممنون ہوں گا۔
(۱) قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ رُوحِ خدا کے حکم "سے" ہے۔ کیا رُوحِ خدا کا حکم ہے؟ اور "رُوحِ خدا کے حکم سے" ہے۔ میں بین فرق نہیں؟
(یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ بعض کتب میں رُوحِ خدا کا حکم ہے "درج" ہے۔
جیسے کیا نئے سعادت از امام غزالی) اگر ان میں فرق ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں تو کیسے؟

(۲) چونکہ استفسار کرنے والے یہودی تھے۔ اس لیے اگر ہم اس خطاب کو انہی کی طرف تصور کریں کہ تمہیں اس کے بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے، تو مسلمانوں کی بابت کیا سمجھا جائے؟

(۳) علما و روح کو دو درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جیسے کہ امام غزالیؒ نے انھیں رُوحِ حیوانی اور رُوحِ انسانی کا نام دیا ہے اور علیؓ جو بریؒ نے نفسِ زیریں اور نفسِ بالا کا سوال یہ سید ہوتا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں کونسی رُوح کی طرف اشارہ ہے اور کیوں؟

(۴) کیا ہندوؤں کا نظریہ آواگون اور مشہور شیعہ فرقہ طیارہ کا نظریہ رُوح باہمی مطابقت سے مستثنیٰ ہیں؟

(۵) مسلمان فلاسفہ جیسے ابنِ رشد نے بھی رُوحِ گلی کا نظریہ پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ہر رُوحِ جسم سے جلا ہونے کے بعد رُوحِ گلی میں چلی جاتی ہے۔ کیا اس نظریہ اور ہندوؤں کے نظریہ تنازع کا سرچشمہ ایک ہی نہیں؟

(۶) غنیۃ الطالبین میں حدیث مذکور ہے کہ آپؐ فرمایا کہ ”نیک رُوح بدن سے یوں آسانی نکلتی ہے جیسے برق سے پانی نکلتا ہے جبکہ بُری رُوح بدن میں پھیل جاتی ہے اور اس شدت سے کھینچی جاتی ہے کہ تمام جسم درد سے بللا اٹھتا ہے۔ (در بابِ آخرت) یہ مفہوم حدیث ہے الفاظ نہیں۔ کیا آپ اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں؟

(۷) رُوح اور بد رُوح میں فرق واضح کریں؟ شکریہ!

الجواب

۱۔ ”امر ربی“ کا مفہوم۔

”رُوحِ خدا کے حکم سے ہے“ یا ”روحِ خدا کا حکم ہے“ میں الفاظ کا فرق تو ضرور ہے مگر نتیجہ مفہوم دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ

دیکھو سب مخلوق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔

(۲۴)

اس آیت میں ”الْخَلْقُ“ سے مراد تمام مخلوق اور ”الْأَمْرُ“ سے مراد تمام قسم کے احکام ہیں

ان تمام احکام میں سے ایک حکم رُوح بھی ہے۔ اب اگر اَلْاَثَر کو ایک اکائی تصور کیا جائے تو رُوح اس کا مجتہز ہوا جیسے کہ ارشاد باری ہے:-

قُلِ الْمَرْءُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷/۸۵) رُوح اللہ کے حکم سے ہے۔

اور اگر اَلْاَثَر سے مراد تمام احکام لیے جائیں تو رُوح بھی ایک مستقل حکم ہے۔ لہذا اگر کوئی صاحبِ اُسمے رُوح خدا کا حکم ہے سے تعبیر کریں تو ہمارے خیال میں مفہوم میں کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

۲۔ رُوح سے متعلق سوال کرنے والے؟

استفسار کرنے والے بھگت سیوا مشرکین تھے جنہوں نے یہودیوں ہی کے کہنے پر حضور اکرم سے چند سوالات پوچھے۔ اپنی میں سے ایک سوال رُوح کے متعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح سے متعلق سوال کے جواب میں جو حقیقت بیان فرمائی ہے کہ "تمہیں رُوح کے متعلق بہت کم علم دیگا گیا ہے" تو مخاطب یہود سے متعلق ہے۔ مشرکین تھے۔ بلکہ اُس کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں غلوہ وہ علم ہوں یا کافر، عالم ہوں یا جاہل، نبی ہوں یا ولی کیونکہ انسان میں مبنی علمی استعداد و فطرت کی کمی ہے۔ وہ رُوح کی گتہ کو سمجھنے سے قاصر و عاجز ہے۔

۳۔ رُوح کی قسمیں۔

رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رُوح حیوانی جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ جب تک گردشِ خون برقرار ہے یہ رُوح بھی موجود ہوگی۔ گردشِ رُک جائے تو رُوح ختم ہو جاتی یا نکل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تک یہ رُوح موجود ہو گردشِ خون برقرار رہتی ہے۔ اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم رُوحِ انسانی ہے جسے رُوحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو انسان خواب میں کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوحِ کاہِ حقہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواسِ خمسہ کی کارکردگی میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دورانِ قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر غلِّ نیازہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے ہوئے آدمی کو آواز سے کہ جگائے تو یہ رُوحِ انسانی دوبارہ جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں قسم کی رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قوی تعلق رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو مجتہز ہیں۔ رُوحِ انسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے تعلق اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، بشاشِ بشاش نظر آتا ہے، اور اگر رُوحِ انسانی کو خواب

میں کوئی ناگوار مادہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چپخنے چلانے لگتا ہے اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر خواب میں کہیں مار پیٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پیٹائی کے اثرات اور نشانات بھی بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاننے کے بعد خود شاد بہ کر سکتا ہے۔

ان ہر دو قسم کی رُوحوں کے باہمی تعلق کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دوسری خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص سوتا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کسی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا تو کب نفسانی خواہ نہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ یہ اب دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر دوسرا خواب اگر رُوح نفسانی کو اللہ تعالیٰ قبض کر لیں تو مزبور حیوانی کی کارگزاری یعنی دوسرا خون خود بخود ختم ہو جائے گا اور انسان پر موت واقع ہو جائے گی۔ ارشاد باری ہے:

”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا
وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا لِنَبِّئُكَ
أَلَيْسَ قَعْنَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَذُرِّيَّتُ
الَّذِي خُلِيَ إِلَىٰ آخِرِ أَمَرٍ مُّسْتَعْيٍ ۚ

”اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت اُن کی رُوحیں
قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں اُن
کی رُوحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)
پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے اُن کو
روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو ایک
مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے؟

(الزمر: ۲۲)

آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

- ۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو ہر دم انسان کے بدن میں موجود رہتی ہے اور دوسری وہ جو خواب میں جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ جاگنے میں بد و نیک قسم کی رُوحیں یا رُوح کے ہر دو جہاں انسان میں موجود رہتے ہیں۔
- ۳۔ رُوح کو قبض کرنا یا موت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے۔ اگر وہ خواب کے دوران نیک نفسانی کو قبض کرے تو بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔

۴۔ بیداری کی حالت پر پوری زندگی اور خواب کی حالت نیم زندگی کی کیفیت ہے جس میں کچھ صفات زندگی کی پائی جاتی ہیں اور کچھ موت کی۔ مگر باریہ کیفیت موت و حیات کے درمیان برزخی حالت کی مظہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دنیا اور آخرت کی زندگی کے درمیان قبر کی زندگی برزخی زندگی ہوتی

ہے۔ فرق صرف یہ ہے، قبر کی زندگی میں موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں، اور خواب کی زندگی میں زندگی کے خواب کے دوران چونکہ کچھ خصوصیات موت کی بھی پائی جاتی ہیں، اس لیے حضور اکرمؐ نے اسے موت سے تشبیہ دی ہے۔

۴۔ تناسخ یا آواگون۔

تناسخ یا آواگون کا نظریہ خالص ہندو فلسفہ ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض متقدمین یا مسلمانوں کے بعض فرقے جو اس عقیدہ کو درست سمجھتے ہیں، اور قرآنی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ باطنیت اور رہبانیت نے جن اسلامی عقائد و نظریات پر غماز کر کے ان کا طعنے بگاڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

امادیت صحیحہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جسے امام بخاریؒ بھی قرآن کی آیت:
 'وَلَا تُخْزِيَنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ'
 "اور اے اللہ مجھے قیامت کے دن
 رسوا نہ کرنا" (۲۹/۸۶)

کے تحت کتاب التفسیر میں لائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تو حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "یا اللہ تیرا وعدہ ہے، تو قیامت کے دن مجھے رسوا نہ کرے گا۔ اور میری اس سے زیادہ رسوائی ہو سکتی ہے کہ میرا باپ اس طرح رسوا ہو رہا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھئے؛ اتنی دیر میں آپ کے باپ (آؤر یا تاریخ) کی شکل تبدیل کر دی جائے گی۔ آپ دیکھیں گے تو آپ کو نجاست میں پتھر اٹھا ایک بجو نظر آئے گا۔ جسے فرشتے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ تاکہ کوئی شخص یہ معلوم نہ کر سکے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو رسوائی سے بچا دیا جائے گا۔ اور ان کے باپ کو بھی اس کے گناہوں کی قرار و اتعی سزا مل جائے گی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر مدققی پڑتی ہے:-

- ۱۔ قیامت کے روز افرات و فرج کو جو اجسام مٹا دیے جائیں گے وہ وہی مانوس انسانی بدن ہوں گے، جنہیں دوسرے رنگ پہچانتے ہوں گے۔
- ۲۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو بجو کا جسم دیا گیا تو بعض ایک اشتنائی صورت ہے جس کے لیے ایک ٹھوس بنیاد ہے۔

۳۔ اللہ کا قانون جتنا وسرا اتنا مستحکم اور ہمہ گیر ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے باپ کو بھی عذاب الہی سے بچا نہیں سکیں گے تو کسی دوسرے پر نفیر یا نانی دلی کی کیا مجال ہے کہ وہ قیامت کے روز کسی کی نجات کا دم بھرے۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا ایک یہ منظر پیش کیا ہے :
 قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۚ
 يَقُولُ أَفَتَكُنَّ مِنَ الْمُصْذِقِينَ ۚ إِذَا

مِنَّا وَكُنَّا مُرَاۤءَاۤءَ وَصِيظًا مَّا ؕ إِنَّا
 لَنَدَّبُهُمْ ثَمَّ ۖ نَكَالَ هَلْ أَتٰهُمْ مَّطْلُوعَةٌ
 فَاطْلَمَ نَكَالَهُ فِي سَوَآءٍ اَنۡجَحِمِمْ ۚ
 (الصّٰفّٰت : ۵۱ - ۵۵)

کہ جھلا تم بھی (ایسی باتیں) باد کہنے والوں
 میں سے ہو، جھلا جب ہم مگنے اور
 مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم گرزت
 ہو سکے گی؟ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کیا
 تم اس سے باخبر ہونا چاہتے ہو؟ پھر جب

جہان کے گاتواس (برے ساتھی) کو دروغ کے وسط میں دیکھے گا؟
 ان آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت انسان بھی اسی فانوس شکل کو ڈھنڈھ رہا ہوگا۔
 جو اس نے دنیا میں دیکھی تھی۔ جو باقیامت کے دن وہی بدن اور وہی شکلیں ارواح کو دی جائیں گی
 جو اس دنیا میں تھیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس دن ایک
 دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ارواح کو وہی اجسام اور وہی
 شکلیں عطا کی جائیں جو دنیا میں تھیں۔

اب دیکھئے نفوسِ قرآنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے دن
 تک مومنوں کی ارواح عقیقین میں اور کافروں کی ارواح سچین میں مقید ہوتی ہیں ان کو کوئی نیا جسم
 عطا نہیں کیا جاتا، اور قیامت کے دن جو جسم عطا کیا جائے گا وہی ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ تو دنیا
 کا بے حاشیہ کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ جس کی رُو سے مرنے کے بعد رُوح کو کبھی کسی گھر سے
 کا جسم عطا کیا جاتا ہے کبھی کبھی پتھر یا پتو کا اور کبھی گتے اور سوز و دھڑکا۔

یہاں ضمناً ایک دو باتیں اور بھی سامنے آئیں۔ جن میں سے ایک تو شہدائے زندگی کے متعلق
 ہے۔ جن کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھیں مردہ مت کہو، وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اور حدیث

میں ہے کہ شہداء کی رُوحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں بھیجی جاتی ہیں اور دوسری بات سراجِ موتی سے تعلق رکھتی ہے۔

روح کا سفر:

روح کا سفر اس طرح ہے کہ انسان جب بطنِ مادر میں فوت ہونے کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں روح داخل کی جاتی ہے۔ پھر وہ بطنِ مادر سے باہر آتا ہے۔ اب یہ بچہ کہلاتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بزرگ ہوتا ہے۔ پھر اس پر موت آتی ہے یعنی قبر کی زندگی یا برزخی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد قیامت کے دن اس طرح کے اجسام مہیا کیے جائیں گے اور یہ بھی پوری زندگی ہوگی۔

شہداء کی زندگی:

اب دیکھئے زندگی کے اس سفر کی منازل میں شارٹ کٹ تو ہو سکتا ہے لیکن واپسی ناممکن ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک بچہ جوان ہونے یا بزرگ ہونے سے پہلے ہی مر جائے یا شکمِ مادر میں ہی مر جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بزرگ یا بچہ بن جائے یا بچہ شکمِ مادر میں واپس چلا جائے۔ شہداء کی نصیبت یہ ہے کہ ان کی قبر کی زندگی یا برزخی جیسے عام اصطلاح میں بھی موت کہا جاتا ہے اور قرآن نے بھی اسے موت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ عذف کر دی گئی ہے۔ اور شہید مرنے کے بعد فوراً جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ ایک استثنائی صورت ہے۔ تو جس طرح یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ اسی طرح ان کے اجسام (سبز پرندوں کی شکل) بھی ایک استثنائی صورت ہے۔ ورنہ قیامت کے دن انھیں پھر وہ جسم عطا کئے جائیں گے جو اس دنیا میں تھے اور لوگ انھیں پہنائیں گے۔

سراجِ موتی:

اور سراجِ موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر علیین یا سببین میں مقید ہیں۔ وہ واپس دنیا میں نہیں آ سکتیں۔ اور نہ ہی شہداء کی وہ رُوحیں دنیا میں واپس آ سکتی ہیں جو براہِ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں۔ اعدادِ بیست صحیحہ میں مذکور ہے کہ جنت میں شہداء سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ”تمہاری کوئی آرزو ہو تو بتاؤ تاکہ وہ پوری کر دی جائے“ تو شہداء جواب دیں گے کہ ”ہمیں تو یہاں سب نعمتیں میسر ہیں، اور ہمیں کیا درکار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بار بار اصرار پر شہدار یہ جواب دیں گے۔ کہ ”پھر جاری آرزو یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ ہم پھر شہید ہو کر مزید بلند درجات حاصل کر سکیں“ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات میرے قانون کے خلاف ہے۔ تم دنیا میں واپس

نہیں جاسکتے۔ کوئی اور بات ہو تو بتائیے؟ پھر شہدار جواب دیں گے کہ پھر کم از کم دنیا والوں کو اور کچھ سے عزیز واقارب کو اس بات سے مطلع کر دیا جائے کہ ہم یہاں کس قدر خوش ہیں اور ہر طرح کے انعامات سے متنع ہو رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ہاں میں یہ اطلاع کیے دیتا ہوں؟ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

”قَدْ خَسِبَ الَّذِينَ قَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالًا بَلْ أَكْثَرُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْزُقُونَ. تَرَجَّيْنَا بِمَا أَنفَعْنَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِمْ وَنَسْتَشِيرُكَ يَا أَلِیُّنَ لَعَلَّكَ تَعْلَمُونَ بِهَذَا مِنْ خَلْقِهِمْ أَكَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“
 سب لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انھیں مرے ہوئے نہ سمجھنا بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور انھیں اپنے رب کے ہاں سے رزق مل رہا ہے۔ جو کچھ فضلے ان کو اپنے فضل سے دے چکی ہے اس میں وہ خوش ہیں۔ امان لوگوں کو: (اس دنیا میں) ان کے پیچھے ہیں اور مر کر ان میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ جو فخری دیتے ہیں کہ ان پر

(آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰)

نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمناک ہیں؟ غور فرمائیے کہ جنت میں شہداء کی آزاد روحیں بھی نہ اپنے عزیز واقارب کو دنیا میں اگر کوئی ہنسا سنا سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی قبر پر پکارنے والوں کو کچھ کہہ سکتی ہیں۔ تو وہ روحیں جو بہترین اور علیین میں مقید ہیں، وہ کیسے دنیا میں واپس آکر دنیا والوں کی بات سنتی یا ان سے ہم کلام ہو سکتی ہیں؟

۵۔ تناسخ اور روح کلی۔

تناسخ کی طرح روح کلی کا نظریہ بھی ہندوؤں کے فلسفے سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو یہ باتیت کے راستہ سے اسلام میں داخل ہوا۔ اور جس کا دعویٰ الہی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہندو فلسفہ روح کی مختلف کیفیتوں کو آتما، مہاتما اور پراتما سے تعبیر کرتا ہے۔ آتما مادہ روح ہے جو عام انسانوں کے جسم میں داخل ہے۔ جب یہ روح مختلف جہانوں سے سفر کرتی ہوئی پاک و پوتر ہو جاتی ہے تو کسی ہندک دہر تر انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور مہاتما کہلاتی ہے۔ مہاتما گاندھی یا مہاتما بھگوان کے ہاں ایسی ہی ہستیاں ہیں۔ پھر جب یہ رو میں مزید پاکیزگی حاصل کرتی ہیں تو پراتما (خدا یا پریشور) کی روضہ کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ اس بعد کیسے مسلمان صوفی بھی حاصل بحق واصل باللہ اور فنا فی اللہ جیسی اصطلاحات وضع کر کے اسی ہندوؤں کے عقیدہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ دعویٰ الہی

اس سلسلہ میں روح کی مثالیں کتب میں بیان فرمائی ہیں :

”كَيْفَ تَنْفَرُونَ بِاللَّهِ وَتَتَّبِعُوا أَمْرًا
نَاحِيًا لَكُمْ تَعْتَمِدُونَ لَوْ لَمْ يَحْيِكُمْ
إِلَٰهٌ فَمَرَجُوهُمْ“

تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو۔ تم مڑھتے
تو اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہی تمہیں
میرتا ہے۔ پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا،
پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ؟

(البقرة: ۲۸)

عام اصطلاح اور اسی طرح شرعی اصطلاح میں بھی روح اور بدن کے افعال کا نام زندگی اور ان کے انفعال کا نام موت ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو روح پیدا ہو چکی ہے اس پر موت نہیں آنے گی۔ اب آیت بالا میں پہلی کیفیت یہ ہے کہ روح قہریلا ہو چکی ہے لیکن اسے ابھی جسم نہیں ملا۔ دوسری کیفیت شکم مادر میں جنین میں روح داخل ہونے سے لے کر موت تک ہے۔ تیسری کیفیت موت سے لے کر قیامت کے دن تک ہے۔ چوتھی کیفیت قیامت سے تعلق ہے۔ جب روح کو اجرام ہتیا کیے جائیں گے۔ اور ہاں جو خدا کے حضور حاضر فیض سے متعلق ہے۔

اب دیکھئے یہاں نہ تو روح کلی کا کہیں ذکر ہے۔ نہ اس میں مدغم ہونے کا، نہ تحلیل کا یعنی نہ تو کوئی روح خدا کی ذات یا فلسفہ کی زبان میں روح کلی میں شامل ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی خدا کسی انسان کے جسم میں حلول کر سکتا ہے۔ آخری منزل ”إِلَٰهٌ تَرْجِعُونَ“ کے الفاظ ان سب نظریات کو مردود قرار دیتے ہیں۔ اگر روح کلی میں انتقال کا نظریہ صحیح ہو تو ”إِلَٰهٌ تَرْجِعُونَ“ کے بجائے ”ذِیْلُ یُلْحَقُونَ“ یا اس قسم کے الفاظ ہونے چاہئیں تھے۔

اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث بھی قابل غور ہیں :

- (۱) عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما مثکم من أحد الا سیکلمہ رجبہ کبیر ۱۰ ورنہ یخرجہ ۱۱
- (۲) عن جریر قال لکنا جلوساً عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ نظر الی القبر لیکلہ البید قال لا تکفوا فودن ربکم
- سعدی بن حاتم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بارگاہ میں سے ہر شخص سے اللہ تعالیٰ ضرور بات کریں گے وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں نہ کوئی مترجم ہوگا اور نہ کوئی حجاب جو اس میں کیے حضرت جریر بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کہ ہم کب دوزخ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں آیت نے جو دعویٰ

کَمَا تَرَوْنَ هَذَا الْقَوْمَ لَتَصْنَعُنَّ
فِي زُرَّتِهِ ۚ
(نہاری کتاب الترحید)

رات کے چاند کو دیکھا تو فرمایا تم منہ رو
(مرنے کے بعد آخرت میں اپنے سب کراں
طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے تھے
اور تمہیں کوئی اُمّہ بن محسوس نہ ہوگی۔)

پھر اس کے بعد اپنے یہ آیت پڑھی:
”وَجِئُوا يَوْمَئِذٍ نَّاصِحَةً اِلَىٰ رِبَّكَانَا طَرَفًا“
(۳۲-۳۳)

اس دن بہت سے جہرے پر رونق ہوں گے
اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔

اب دیکھئے اگر روح کے مدعی کلی میں اتصال کا نظریہ صحیح ہو تو یہ دیدار الہی، یہ خدا سے ہم کلامی
اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے حساب کتاب لینا، آخر یہ باتیں کس کھاتے میں رہیں گی؟
ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ روح کلی میں اتصال کا نظریہ گمان دھبان کا نظریہ تو ہو سکتا
ہے۔ وہی الہی کلی طور پر اس سے بالکل ہمتی ہے۔

۶۔ حالت نزع کی رنج و راحت۔

حرمِ حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث موجود و مرید ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس
انسان کی روح دنیا اور اس کے تعلقات کی محبت میں جس قدر زیادہ پھنسی ہوئی ہوگی، حالت نزع میں
اس کی جان بارودِ آتش ہی مشکل سے بچے گی۔ اور جس شخص کی روح دنیا اور اس کے تعلقات میں رکھی
اس سے بے نیاز رہی ہے وہ روح آسانی سے نکلے گی۔ اس بات کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ
کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک پہلو سے متعلق ہے۔ اس میں بھی تفصیلات موجود ہیں۔ خود حضور اکرم
نے حالت نزع میں کافی تکلیف اٹھائی۔ حالانکہ آپ مذہب کے بلند ترین مقام پر نازل تھے۔ حالت نزع
میں آپ نے جو تکلیف دیکھی اُسے دیکھ کر حضرت عائشہ صدیقہ نے اس نظریہ کو شکوک قرار دیا تھا۔
اس تکلیف کی وجہ خواہ زہر کے اثرات کا مرض الموت میں دوبارہ عود کرنا ہو یا کوئی دوسری وجہ ہو۔
بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے مرض الموت میں کافی تکلیف اٹھائی تھی۔

۷۔ یدِ رُوحیں۔

بارودِ روح سے مراد وہ رُوحیں ہیں جو وحی الہی کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتیں۔ خواہ یہ رُوحیں
انسانوں سے تعلق رکھتی ہوں جو بہتہ میں مقید ہیں یا ابھی اسی دنیا میں ہیں۔ یا شیطانی رُوحیں یا جنوں
کی رُوحیں جو اسی دنیا میں موجود ہیں۔ انسانوں کو گمراہ بھی کرتی ہیں اور تکلیف بھی پہنچاتی ہیں۔ قرآن

میں ہے! **وَاللّٰهُ كَاۡنَ بِرَجَالٍۭ مِّنَ الْاَوَّلٰی۪نَ یَقُوۡدُوۡنَ**
بِرَجَالٍۭ مِّنَ الْاٰخِرِی۪نَ كَذٰلِكَ دُوۡلَتُهُۥ رَحَقًا
 ”اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض قبائل کی پناہ
 پکڑا کرتے تھے۔ اُس سے اُن کی سرکشی اور
 بڑھکئی تھی؟ (البقرہ: ۶۱)

اور حضرت رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو بیت الخلا میں جلنے سے پیشتر یہ دُعا سکھلائی ہے:
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الْخُبۡثِیۡتِ
وَالنَّجَسَاتِیۡتِ
 ”اے اللہ میں بد رُوحوں سے خواہ وہ نمر
 ہوں یا مادہ، تیری پناہ میں آتا ہوں؟“
 بد رُوحوں سے بچنے کا یہی طریقہ مسنون ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ مختلف قسم کے چٹے اور چستین
 کر کے، شش نفل اور ہفت ہیکل وغیرہ وضع کر کے ایسی رُوحوں سے اپنی مرضی کے کام لیتے۔ لوگوں کو ضرر
 پہنچاتے یا اُن کے ضرر سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ سب مشرکانہ افعال ہیں۔ ایسی رُوحوں کے
 ضرر سے بچنے کے لیے معوذتین کا ورد، سورہ جن کی تلاوت، منظر بد کی دُعا یا بیت الخلا سے جانے
 سے پہلے کی دُعا وغیرہ جو باتیں مسنون ہیں وہ تو عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ لیکن جن اعمال و وظائف اور اُرد
 کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اُن کے استعمال سے بہر حال پرہیز ضروری ہے۔
هٰذَا مَا عَنِیۡنِیْ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ!

— ۲ —



روح، عذاب قبر اور سماع موتی

(یہ مقالہ محدث صفر، ربیع الاول ۱۴۰۳ھ میں شائع ہوا۔)

کچھ عرصہ قبل راقم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں روح سے متعلق چند امور زیر بحث آئے تھے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مجھے دو حضرات کی طرف سے یہ سوال نامے موصول ہوئے ہیں۔ پہلے سائل جناب عبدالقادر صاحب سومرو کراچی سے لکھتے ہیں کہ:

”مکرمی جناب کیلانی صاحب،

آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ:

”اور سماع موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر علیین یا ستمین میں مقید ہیں وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور وہی شہداء کی وہ روحیں دنیا میں واپس آ

سکتی ہیں جو راہ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں؛

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ سماع موتی ناممکن ہے۔

۲۔ مرنے کے بعد اعوار کا دوبارہ جسموں میں آنا ناممکن ہے۔

اور توہا قرآن و احادیث؛ صحیحہ اس پر گواہ ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس جسم

میں روح نہیں آسکتی۔ لیکن دوسری طرف مولانا سیف الرحمن اعجاز نے اپنے ایک مضمون میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

”ہجرت کرنے والی مومن عورت کی دھار سے اللہ نے اس کے بیٹے کو دوبارہ زندہ

کیا۔“

پھر جب ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب ”اقتضای العراط المستقیم“ اور کتاب ”الوسیلہ“

کا مطالعہ کیا تو عقل حیران رہ گئی کہ صرف یہی نہیں کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو گیا، بلکہ اُس نے مادہ کی

ساتھ کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد جب غور سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو ذہن بڑی الجھن کا شکار ہو گیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ان نظریات اور عقائد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن ان کتابوں میں تو انھوں نے ان تمام باتوں کو مان کر سند سے دی جو آج کفر و شرک کی بنیاد ہیں۔

شیخ الاسلام دونوں کتابوں "اقتناء العرط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" میں لکھتے ہیں:

۱۔ "جب کوئی شخص کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے، جسے وہ دنیا میں جانتا تھا اور اس پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح اس میں ٹوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے؛

(کتاب الوسیلہ ص ۲۲، اردو ترجمہ اسلامی اکادمی لاہور: اقتناء العرط المستقیم، اردو ترجمہ مجلس نشر اسلام آباد)

۲۔ اس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضرتؐ پر سلام کا جواب مانا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب نے واقعہ عترہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی ٹھوٹی اذان سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ہو سکتا ہے؛

(اقتناء العرط المستقیم ص ۲۲، اردو ترجمہ)

۳۔ "بہر حال میت کا قرآن اور دوسری آوازیں سننا تو حق ہے، لیکن مرنے کے بعد عمل پر اسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن مردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے؛ (حوالہ مذکور ص ۱۳)

مختتم: یہ چند سوالات آپ کو بھیج رہا ہوں، اس پر کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں تبصرہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام!

دوسرے سائل محمد احسان الحق صاحب یار و خیل میانوالی (حال اسلام آباد) سے لکھتے ہیں کہ:

"محترم! ایک عرصہ سے میرے ذہن میں مسئلہ مذاپ قبر کے متعلق الجھن اور غلط فہمی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ عذاب قبر حق ہے۔ قبر منازلی آطرت میں سے ایک بلکہ پہلی منزل ہے۔ اس منزل سے کامیاب گزرنے والا آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور جو یہاں پکڑا گیا اس کی آخرت کی بھی خیر نہیں۔ عذاب قبر کے بارے میں مجھے جو اشکال ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زندگی موت کی مندر ہے۔ جب روح جسم میں پڑتی ہے تو جلا متی ہے اور حب بحال لی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر یوم البعث کو یہ روح دوبارہ جسم میں آئے گی تو انسان

زندہ ہو گا۔ دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک حوصلہ ہے، جسے برزخ کہتے ہیں، اسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ زندگیاں تو از روئے قرآن دو ہیں اُحد موتیں بھی دو، تو یہ برزخی زندگی کیا ہے؟

۲۔ عذابِ قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق رُوح سے ہے؟ بعض مشائخ نے سنا ہے کہ رُوح کا عکس جسم پر رہتا ہے لہذا جسم کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو حساب کا کیا مطلب؟

۳۔ ”مَتَّعًا اَوْ ذُوْحَةً فِیْ جَسَدٍ“ کا کیا مفہوم ہے؟ نصوصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ جب رُوح اور جسم ملیں گے تو انسان فوراً اٹھ کھڑا ہو گا۔ جیسے سورہ یس میں ہے: ”وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِنْ اَنْۢبَاۡءٍ اِلٰی رَبِّہِمْ یَسْمَعُوْنَ“

۴۔ کتبِ حدیث میں ہے کہ جب مرنے کو دفن کر کے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ اُن کے بھوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے کہ اُس کے پاس منکر اور نکیر آجاتے ہیں۔ جب رُوح جسم سے نکل جاتے تو حواسِ خمسہ بھی جاتے رہتے ہیں پھر وہ کس طرح سُنا ہے؟ قرآن بھی تو کہتا ہے: ”اَمْ لَہُمْ اَذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ اَمْ لَہُمْ“

۵۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اپنی تصنیف ”الایات القویۃ علی ان حیوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ لیست بذیویۃ“ میں منکر پر سوال ”کتاب الریح“ (از ابن قیم) فرماتے ہیں:

”برزخ کا تعلق اس میں گویا مددگار ہو جاتی ہے لیکن خبرِ جزئی کہی نہیں ہوتا بلکہ سلام کے جواب کے لیے اُسے نوایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ذیوی زندگی نہیں ہوتی جو اُسے مرنے سے پہلے حاصل تھی“

۶۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن بندہ پر جب وہ بھیک جواب دیتا ہے تو قبرِ مد نظر تک فرخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کافر پر قبرِ تنگ ہو جاتی ہے اُسے بھیخ لیتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک صحابی رسولؐ پر قبرِ تنگ ہو گئی؟

۷۔ جب از روئے قرآن مُردہ نہیں سن سکتا ”وَهُمْ عَنْ دُعَاۡیِہِمْ غٰفِلُوْنَ“ تو سفید ماضی اور حریفِ ندامت کے ساتھ ”اَسَلِّمُوْا عَلَیْکُمْ یَا اَہْلَ الْقُبُوْرِ“ کیوں کہتے ہیں؟

۸۔ کتاب الریح (از ابن قیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

محترم! اصولی سربہجہ کی روشنی میں میرے ان اشکالات کا تدارک فرمائیے !
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ !

الجواب بعون الوهاب

رُوح کے متعلق بحث ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ خالق عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ :

”وَمَا أَوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“ (ہنئ اسرئیل : ۸۵)

”اور تمہیں موع سے متعلق فقط وہی علم عطا کیا گیا ہے ؟“

جس کا واضح مطلب ہے کہ رُوح کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا انسان کے لیے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن انسان کی عادت ہے کہ جس بات سے متعلق اس پر بندش عائد کی جاتے، وہ اس بات کی کرید و تفتیش میں دوسری باتوں سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک مسئلہ تقدیر کا تھا جس پر بحث کرنے سے ملاحظہ روکا گیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر حضرت انسان نے اپنی تحقیق و تفتیش سے وہ وہ گل کھلائے کہ اسی مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر امت مسلمہ کے دو فرقے پیدا ہو کر آپس میں متحارب ہو گئے۔ رُوح کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اس پر بھی جن جن علماء نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تفصیل میں بہت اختلاف واقع ہوا۔ محولہ بالا مضمون میں میں نے رُوح سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ تفصیل پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے براہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زندگی اور موت کے چار مراحل :

جسم اور رُوح کے انفعال کا نام موت اور اتصال کا نام زندگی ہے۔ عام ضابطہ الہی کے مطابق دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ پہلے موت ہے پھر زندگی، پھر موت ہے پھر زندگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

”كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ“

لَهُمَّ الْيَوْمَ جَعَلُونَا (البقرة: ۲۸)

”تم خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو، اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر تمہیں مارتا ہے پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے؟ اور قیامت کے دن کفار بھی یہی اقرار کریں گے کہ:

”قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَتَيْنِ وَاٰخِرَتِنَا اِثْنَتَيْنِ قَاعَزَوْنَا بَیْذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ؟ (المومن: ۱۱)

”ہمیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم کو دوبارہ موت دی اور دوبارہ زندہ کیا۔ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو کیا اب (جہنم کے عذاب سے) بچنے کی کوئی سبیل ہے؟

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے زندگی سے پہلے موت کا ذکر کیا ہے۔ زندگی کی طرح موت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے جو زندگی سے پہلے پیدا کی گئی۔ گویا موت محض عدم یا کسی سلبی چیز کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات سے پہلے پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰاتَ لِيَّبْكُوْكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا“ (الشعرا: ۷۸)

”اسی نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے؟

پہلا مرحلہ موت ہے۔

پہلا مرحلہ موت ہے اور اس سے مراد وہ دور ہے۔ جب اللہ رُوحوں کی پیدائش کب ہوئی؟ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام رُوحوں کو بھی پیدا فرمایا، جو اس کی پشت سے تاقیامت پیدا ہونے والی تھیں۔ ”عہدِ اُنت“ اسی دور سے متعلق ہے۔ (الاعراف: ۱۷۲) اور یہ دور رُوح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکمِ مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ رُوح اگرچہ ایک زندہ و متحرک اور عقل و شعور رکھنے والی چیز ہے۔ لیکن چونکہ ابھی اس رُوح کو جسم نہیں ملا جو اعمال کے صدور کا ذریعہ ہے، لہذا اس دور کو موت سے تعبیر کیا گیا۔

اسی دور کے متعلق دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ“

(الاحقاف: ۱۱)

”ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔“

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

- ۱۔ تمہاری تخلیق فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے سے پیشتر وقوع پذیر ہو چکی تھی۔
 - ۲۔ اس تخلیق کے وقت تمہاری صورتیں بھی بنادی گئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ رُوح بھی شکل و صورت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید ان احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں مذکور ہے کہ فرشتے جب کسی نیک مسلمان کی رُوح قبض کرتے ہیں، تو اس رُوح کو ریشی لباس میں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس رُوح کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس رُوح کی شکل و صورت بھی بالکل وہی ہوتی ہے جو اُس کو مٹنے والے جسم کی ہوتی ہے یا ہوگی۔ بھی تو رُوح میں بھی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور اس رُوح کی قالب میں مثال یوں سمجھئے جیسے زیتون کے درخت میں دو غن زیتون یا کوئٹہ میں آگ یا جھلنے والی گیس۔
 - ۳۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح کی تخلیق اور اس کو شکل و صورت عطا کرنے کے باوجود اس دور کو عام زمانہ کے مطابق موت کے زمانہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی موت کی تخلیق کا مفہوم ہے۔
- اب ان چاروں مراحل کی کیفیت اس طرح ہوتی کہ:
- (۱) پیدائش رُوح سے لے کر اُس رُوح کو مادہ شکم میں داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۲) شکم مادر میں جسم میں رُوح کے داخل ہونے سے لے کر موت تک کا عرصہ۔ اسے زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۳) موت سے لے کر قیامت کو دوبارہ اجسام میں رُوح کے داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۴) قیامت کو دوبارہ جی اُٹھنے کے بعد لا متناہی مدت۔ اس عرصہ کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- اب دیکھتے کہ ان چاروں ادوار میں عدم یا فنا اگر ہے تو جسم کو ہے۔ رُوح جب سے پیدا

ہوتی۔ اُس کے معنوم یا فنا ہونے کا کوئی مرحلہ پیش نہیں آیا۔ جب روح اکیلی ہوتی یا رہ جاتی ہے تو اُسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو اُسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا مرحلہ :- دنیوی زندگی

اس مرحلہ میں روح بدن میں داخل رہتی ہے۔ یعنی جنین میں روح کے داخل ہونے یا جان پڑنے سے لے کر روح کے جسم سے نکل جانے یا مرنے تک کا عرصہ دنیوی زندگی کہلاتا ہے۔ زندگی کہنے کا اصل سبب تو یہی ہے کہ اس عرصہ میں روح و بدن کا کُلّی اتصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتصال کُلّی کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ گو یا اس موت و حیات کے قانون میں استثناء کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ تاکہ برزخ کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

استثنائی صورتیں :

اُدھر جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام ضابطہ یا قانون قدرت یا سنت اللہ یا عادت عامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے بناتے ہوئے قوانین کے آگے مجبور و بے بس نہیں ہے بلکہ ان تمام قوانین فطرت یا قدرت کے خلاف گا بے گا ہے اس کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور یہ بات اس آگ کی فطرت میں داخل ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت آگ کو یہ حکم دے کہ فلاں شخص کے حق میں "مقتل"ی اور سلامتی والی بن جا۔ تو آگ کو اپنی اصلی فطرت چھوڑ کر اللہ کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ پھر یہی کام کا کام کا مٹنا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے حکم سے پھر یہی اس خاموشیت کو سلب بھی کر سکتے ہیں۔ انتہا کا یہ کام ہے کہ افتراق کے بعد اس کے اجزاء فرعون اہل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ دریا کو یہ حکم دے کہ پھٹ کر بہاؤ کے تودوں کی طرح ٹک با اور درمیان میں کشادہ راستہ بنا دے۔ تو دریا کو اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا صرف ایک قانون ایسا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اودے قانون قوموں کے غرور و ذوال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم بد کرداری کی انتہائی پستیوں کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ خواہ یہ تباہی جلد ہو یا بدیر۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو "سُنَّةُ اللّٰہِ" کہا ہے۔ اور قرآن کریم میں بار مختلف مقامات پر ذکر کر کے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ اس "سُنَّتِ اللّٰہِ" میں کوئی تغیر و تبدل یا لچک نہیں ہے۔

۱۔ اچھا سے موتی یا اسی ذیوی زندگی میں مُردوں کا زندہ ہونا؛
رہا موت و حیات کا قانون، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی استثنائی صورتیں قرآن
کریم سے واضح طور پر ثابت ہیں؛

۱۔ حضرت عیسیٰ مُردوں کو ”قَدْ بَاذَنَ اللہ“ کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔
۲۔ حضرت عزیر کا ایک اُچھڑی ہوئی اور ویلاں شدہ بستی پر گزرا ہوا تو کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ
اس مُردہ بستی کو کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پورے سو سال کے لیے موت
خسے دی۔ پھر زندہ کر کے پوچھا۔ اب بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ یہاں پڑے ہو؟ کہنے لگے کہ
”یہی کوئی دن آدھ دن کی بات ہوگی“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”مہینے بکہ تم تو سو سال موت کی
حالت میں پڑے رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو تمھارے سوا کسی کے گدھے کے پیچھے کے سوا اور کوئی
چیز رہ گئی؟ دیکھو اب ہم تمھارے سامنے اس پیچھے کو کیوں کر گوشت پوست پہنا کر کے اُسے
پھر سے زندہ کئے دیتے ہیں“ (البقرہ: ۲۵۹)

۳۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ قاتل کا پتہ نہ چلا تھا۔ سب مشتبه لوگ ایک دھڑے
پر انعام دھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ پھر اس
مذبوح گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ تو یہ لاش خود اپنے قاتل کا
پتہ بتلا دے گی۔ چنانچہ جب اس لاش پر مذبح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارا گیا۔ تو مُردہ
زندہ ہو گیا۔ اُس نے باتیں کیں اور اپنے قاتل کا پتہ بھی بتلادیا۔ (البقرہ: ۱۷۱)

۴۔ حضرت موسیٰ جب تورات لے کر کوہ طور سے بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے، تو اس بدشمت
قوم نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے اُتری ہے۔
ہم میں سے کسی نے بھی اسے اللہ کی طرف سے اُترنے کو دیکھا نہیں۔ پھر یہ یقین کیسے ہو؟
موسیٰ نے قوم کے اس بے بنیادہ اعتراض سے نجات کی۔ یہی راہ دیکھی کہ اللہ تعالیٰ سے التجا
کریں۔ چنانچہ وہی الہی کے مطابق اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو چُنا اور کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں
جا کر جب ان ستر آدمیوں نے اپنے مطالبہ کو دہرایا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور تورات کے
اترنے کا منظر دیکھنے پر اصرار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک کڑک بھیج کر ان سب کو موت کے
گھاٹ اتار دیا۔ اب حضرت موسیٰ پھر اللہ سے التجا کرنے لگے۔ بارِ الہی! ان بے وقوفوں
کی اس خواہش پر تُو نے انھیں مار دیا۔ اب میں کیسے واپس جاؤں اور قوم کو کیا کہوں؟ تو

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لَقَدْ بَعَثْنَا لَقَوْمٍ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكَ“ (البقرة: ۵۶)

”پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا“

نیز دیکھئے: الاطراف: ۱۵۵

۵۔ حضرت ابراہیمؑ نے معنیٰ ایمان قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کیا کہ ”اے میرے چڑگا“

تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ ”یوں کرو کہ چار پرندے لے کر

اُن سے ثرب مانوس ہو جاؤ تاکہ اُن کی شکل و صورت کو خوب پہچان سکو۔ پھر اُن کو ذبح کر کے

اُن سب کا گوشت ابھی طرح ملا دو۔ پھر اُسے بٹے بٹے گوشت کو چار حصوں میں تقسیم کر دو اور

ہر حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر واپس آ کر انہیں ایک ایک کر کے پکار دو تو وہی پرند

تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے گا جسے تم پکارو گے۔ اسی طرح چاروں پرندے تمہارے بٹانے

کی ترتیب کے مطابق تمہارے پاس حاضر ہوتے جائیں گے“ (البقرہ: ۲۶۰)

۶۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں لوگ جہاد کے لیے نکلے تو کھڑے ہوئے لیکن دشمن کے مقابلہ اور

موت کے ڈر سے اُن کی جان گویا پہلے ہی نکل رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہیں موت

جے دی، کہ جس بات سے ڈرتے ہو اس کا تو ابھی مزہ چکھو۔ پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو معرفت

عبرت دلانا مقصود تھا۔ لہذا انہیں پھر سے زندہ کر دیا۔ (البقرہ: ۲۴۲)

یہ تمام واقعات قرآن کریم میں بھراحت موجود ہیں۔ ہم نے کسی واقعہ کی تشریح و تفسیر

اپنی طرف سے بیان نہیں کی بلکہ صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر

عام قانون الہی یہی ہے کہ ہر شخص کو دوبارہ زندگی اور دوبارہ موت سے دوچار ہونا ہے مگر کسی

کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت بھی مقدر ہو سکتی ہے۔ گو ایسے واقعات شاذ و نادر

ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں تاہم ان کے امکان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جو لوگ ایسے واقعات

کی تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ کی جاری و ساری قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔

ب۔ نیم زندگی (خواب) یا برزخی موت:

اب دیکھئے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر انسان کو موت کا ہلکا سا نقشہ دکھلا دیا گیا ہے

اور یہ موت نیند کی حالت ہے جسے ہم برزخی موت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے نیند کو موت کی بہن قرار دیا ہے۔ نیز سونے کے بعد جاگنے پر جو دُعا رکھ لاتی۔ یعنی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَاَنَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاَلِیْہِ الشُّوْر۔ اس دعا میں نیند کو موت سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ شُور کا لفظ بعث بعد الموت کے لیے آتا ہے۔

برزخ کا لغوی مفہوم | برزخ کے معنی بالعموم پردہ یا ازکر لئے جلتے ہیں۔ جبکہ عربی زبان میں پردہ کے لیے آدھی بہت سے لفظ موجود ہیں مثلاً ستر، حجاب، غطار، غلف، اگنتہ وغیرہ۔ اور ان سب الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق موجود ہوتا ہے۔ برزخ دراصل دو مختلف یا متضاد چیزوں کے درمیان ایک ایسی تیسری چیز کا نام ہے۔ جس میں پہلے دونوں اشیاء کے طے جملے اوصاف پاتے جاتے ہیں اور وہ آڑ کا کام بھی ہے۔ خواہ یہ اوصاف برابر برابر ہوں یا کسی ایک چیز کے کم اور دوسری کے زیادہ۔ جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعراف برزخ ہے۔ جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برزخ ہے۔ جو برہمچا اور شاخیں تو نباتات کی طرح پھیلتا ہے۔ مگر نوع کے لحاظ سے پتھر ہے اور جمادات میں شامل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ پیٹھے اور کھاری پانی کے درمیان ایک برزخ کی رو پیدا کر دیتا ہے جسے قرآن کریم میں برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اسی لحاظ سے برزخ ہے کہ اس میں زندگی اور موت کے طے جملے آثار پاتے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں غالب اثرات زندگی کے ہی ہوتے ہیں موت کے نہیں۔

برزخی موت یا نیند | اسی نیند کے معاملہ پر غور کرنے سے رُوح کی بحث بھی شروع ہو جاتی ہے سب علماء اور اطباء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں: ایک تو رُوح حیوانی ہے جس کا تعلق گردش خون سے ہے۔ (اسی رُوح کو بعض حضرات نے نفس زیریں سے بھی تعبیر کیا ہے) جب تک گردش خون برقرار رہے رُوح چھوڑ دے اگر یہ رُوح نعل جائے تو گردش خون ختم ہو جاتی ہے۔

رُوح انسانی یا نفس | دوسری قسم رُوح انسانی ہے۔ جسے نفس بالا یا رُوح انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو خواب میں سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواس خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوتِ سامعہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں اگر غل غباٹ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے جوتے آدمی کو آواز دے کہ جھکائے تو رُوح انسانی دوبارہ فوراً اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جلتے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس رُوح انسانی کو اپنے قاب سے شغ کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی قاب اس رُوح انسانی کی آرزوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی نفس کو مخاطب کیا ہے تو اس

سے مراد ہمیشہ یہی نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور فوری تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جزو ہوتے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشاش بشاش نظر آتا ہے، اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار عارضہ پیش آ رہا ہے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چپخنے چلنے لگتا ہے۔ اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں خواب میں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اور چائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاگنے کے بعد خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

خواب سے ہر انسان کو بکثرت واسطہ پڑتا رہتا ہے اس خواب سے بھی چند ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۱۔ خواب میں اس رُوحِ نفسانی کی شکل و صورت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے بستر پر پڑے ہوئے (سوتے ہوئے) اس کے قالب کی ہوتی ہے۔ اور خواب کے دوران جب رُوحیں آپس میں ملتی ہیں تو اس شکل و صورت کی ہم آہنگی کے واسطے سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ ان ہی رُوحوں کی آپس میں ملاقات ہو جو اس دنیا میں زندہ کہلاتے ہیں۔ یہ ملاقات ان لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس جہان سے رحلت کر چکے یا مر چکے ہیں۔ زندہ کی رُوح مردہ کی رُوح سے بھی ملاقات کر سکتی ہے اور اس کے برعکس بھی۔

۳۔ خواب میں جو واقعات رُوح کو پیش آتے ہیں ان واقعات کے بیشتر اثرات سے اس رُوح کا مادی قالب بے بہرہ رہتا ہے۔ خدا ایک شخص خواب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ لیکن جب جاگتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے۔ البتہ کچھ کچھ واقعات ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن سے انسان کا مادی قالب بھی متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم عام قاعدہ یہی ہے کہ مادی قالب رُوحِ نفسانی سے خواب کے دوران پیش آمدہ واقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ خواب میں رُوحِ راضیہ و عالم یعنی ثواب و عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مریض باقی

ہے اور کبھی تو خواب میں زندہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بیداری پر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب میں تو مگر گیا تھا مگر حقیقتاً زندہ ہے۔

یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان مشاہدات و تجربات کی وجہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: ”وَمَا آتَيْنَاهُم مِّنَ الْغُلُوبِ إِلَّا قَلِيلًا“

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دوسری قسم کی رُوح از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص گویا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کسی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو رُوحِ انسانی خواہ کس بھی تیر کر رہے ہوگی۔ اب یہ دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اسے وہیں قبض کر لے گا۔ اسی کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی رُوحِ انسانی کو خواب میں قبض کر لیں تو بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی عارضہ یا بیماری کے مر جائے گا۔ ارشاد باری ہے:

”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا فَبَرِّئُكَ
الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأَخْلَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى“

(الزمر: ۴۲)

”اللہ تعالیٰ موت کے وقت کسی شخص کی رُوح کو قبض کر لیتا ہے اور اس شخص کی رُوح کو کبھی جو خواب میں ہے اور ابھی مرا نہیں۔ پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے اُن کو روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو جو (خواب دیکھ رہی ہیں) ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔“

آیت مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے قوی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ رُوح جو کسی حالت میں بھی بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور یہ رُوح حیوانی یا نفیس زیریں ہے۔ دوسری وہ رُوح جو خواب میں بدن کو چھوڑ کر تیر کر رہتی پھرتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ رُوح نفیس بالایا رُوحِ انسانی کہلاتی ہے۔ اسی رُوح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتا ہے۔ اور اسی رُوح کو دوام ہے۔

۲۔ رُوحِ حیوانی یا نفیس زیریں کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس رُوح کا کوئی وجود

ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رُوح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی۔ موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا بلکہ جسد بیت۔ لاش یا فاش کہلاتا ہے۔

۲۔ بیداری کی حالت میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں انسانی جسم میں موجود رہتی ہیں۔ اوسطاً ہر انسان اپنی زندگی کا تیسرا حصہ وقت سو کر گزارتا ہے۔ گویا اس دنیوی زندگی کا تیسرا حصہ وقت برزخی موت ہے۔ پھر اس دنیوی زندگی میں اس برزخی موت کی حالت میں بھی زندگی کے آثار و موت کے آثار سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں فطرتاً بارہواں حصہ وقت انسان پر موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔

تفسیر امر حلیہ: موت سے لے کر حشر تک عرصہ موت

چونکہ اس عرصہ میں رُوح کو بدن میسر نہیں آتا۔ لہذا یہ عرصہ موت ہے۔ مگر دنیوی زندگی کی طرح اس عرصہ موت میں بھی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ عذاب قبر

اب دیکھتے جس طرح انسان دنیوی زندگی میں موت کے اثرات سے دوچار ہوتا ہے، بعینہ اسی طرح عرصہ موت (مرنے کے وقت سے لے کر روز قیامت تک کی موت) میں زندگی کے اثرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو عمار نے کئی طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ رُوحیں سچیں اور علیین میں ہوتی ہیں۔ تاہم ان رُوحوں کا ہلکا سا تعلق اپنی اپنی قبروں سے قائم رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان رُوحوں کا عکس قبر پر بھی پڑتا ہے بعض دوسرے عمار نے اس حقیقت کو توئیں ادا کیا کہ اس عرصہ موت میں رُوح اور بدن کا انحصار کئی نہیں ہوتا۔ گویا رُوح اور بدن کا تعلق قائم تو مستقل طور پر رہتا ہے مگر یہ تعلق بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

مجھے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ:

عذاب قبر کی حقیقت

(۱) اس عرصہ موت میں رُوح و بدن میں کئی طور پر انفصال ہو جاتا ہے مگر جس طرح دنیوی زندگی میں بجاتِ خواب کبھی کبھار رُوح بدن کو چھوڑ جاتی ہے۔ بعینہ اس طرح موت میں کبھی کبھی رُوح اپنے بدن سے آلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں

انسان سونے یا آرام کرنے کے لیے کسی مدت تک خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن خواب اور اس میں مٹوج کے واردات اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جبکہ اس ہندخی عالم میں کچھ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ سب کچھ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ گویا رُوح و بدن کا یہ تعلق قمر ہلکا اور کمزور ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر مستقل ہوتا ہے اور اضطرابی بھی۔

۲۔ پھر جس طرح، ایک دن رات یا ۲ گھنٹہ کے عرصہ میں انسان رات کو یا کسی وقت دن کو سوتا ہے تو خواب کی صورت میں اُس کی رُوح بدن چھوڑ جاتی ہے، اسی طرح اس عرصہ موت میں دن میں ایک دوبار اپنے قالب یا قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

۳۔ پھر جس طرح خواب کی حالت میں رُوح کے بدن کو چھوڑنے کے وقت بھی حقیقتاً حیات کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں رُوح کی بدن سے ملاقات کے دوران بھی موت کے آثار غالب رہتے ہیں۔

۴۔ نیز جس طرح خواب میں رُوح راحت و اَلَم سے دوچار ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے اثرات بدن پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں رُوح کو عذاب و ثواب ہوتا ہی ہے، تاہم اس ملاقات کے دوران اس کے اثرات جسم یا اس کے فزات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور یہی عذاب و ثواب کی حقیقت ہے۔

اب دیکھئے امام بخاریؒ نے قرآن کی درج ذیل آیت سے عذاب قبر

قرآن اور عذاب قبر

کا استشہاد کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

الَّذِينَ يَمُوتُونَ عَلَيْهِمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةِ أَدْخَلْنَاهُمُ

فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (المومن: ۴۶)

”وہ صبح و شام آگ و آتش جہنم پر پیش کئے جلتے ہیں۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی تو ہم حکم دیں گے کہ، آئی فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو“

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عَذَابٌ أَلِيمٌ کے الفاظ ہمارے اسی موجودہ نظام شمسی کے حساب سے ہیں۔ دن بھر میں

ایک دوبار عذاب پر پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ رُوح اور بدن کا اتصال مسلسل

نہیں ہے۔ ورنہ فرعون جیسے ظالم اور کافر کو تو قبر میں عذاب مسلسل ہی دیا جانا چاہیے تھا۔

۲۔ انھیں صرف عذاب پر پیش کیا جاتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح خواب میں

راحت و آلم کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے اسی قبر میں عذاب و ثواب کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے۔ یعنی عذاب و ثواب کا اثر قیامت (زندگی) کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔
۳۔ البتہ قیامت کے دن ان لوگوں کو فی الحقیقت آتش جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ زندگی کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں روح و بدن کا تعلق مسلسل اور مستقل طور پر قائم ہے لہذا عذاب و ثواب شدید بھی ہوگا اور مستقل بھی۔

دوسری آیت جس سے امام بخاری نے عذاب قبر کا استنباط کیا ہے۔ وہ استشہاد کی حد تک تو درست ہے مگر اس سے مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

”وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ“ (الانعام: ۹۴)

”کاش تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی؟“

یہ آیت درج کرنے کے بعد امام بخاری لفظ ھُون کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ ۙ الْهُونُ هُوَ الْهَوَانُ وَالْهُونُ الْوَقْفُ“۔

(بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ما ہمار فی عذاب المقبر)

”امام بخاری نے کہا کہ ھُون کا معنی ھَوَان یعنی ذلت اور رسوائی ہے۔ اور ھُون کا معنی زحیٰ اور ملائمت ہے؟“

آیت بالا اور امام صاحب کے اجتہاد سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عذاب (و ثواب) قبر مرنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ ”الיום“ کے لفظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عذاب بھی گود ذلت و رسوائی کا ہوگا۔ تاہم اشتداد العذاب یا عذاب عظیم کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوگا۔

ہمارے اس خیال کی تائید بہت سی احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ مومن کے پاس قبر میں فرشتے آتے ہیں، تو پہلے اس پر دوزخ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں بد اعمالیاں کرتے تو تمہارا ٹھکانا یہ دوزخ ہوتی۔ پھر اس پر جنت کو پیش کر کے کہا جاتا ہے

کہ چونکہ تم نے دنیا میں اپنی زندگی احکامِ الہی کی اطاعت میں بسر کی ہے۔ لہذا اب تمہارا عطا کا جنت ہوگا۔ پھر جنت سے ایک روزن اس کی قبر میں کھول دیا جاتا ہے۔ اور کافر سے معاملہ بعینہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قبر اور جنت | انسان کو جب قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے جسم کو مٹی یا کھریے کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک مدت بعد بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات قبروں کے نشان تک بھی مٹ جاتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کا یہ جزئی اتصال آخر کون سے بدن سے ہوتا ہے۔ اور جب قبر کے نشان تک مٹ کر اس پر بازار بن چکے ہیں یا کھیتی کاشت کی جا چکی ہو تو وہ قبر ہے کون سی جس میں عذاب ہوتا ہے؟

اس سے آگے چلئے بعض لوگ اپنے مردوں کو دفن ہی نہیں کرتے بلکہ لاش کو جلا دیتے ہیں پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی عورت یوں واقع ہوتی ہے کہ انھیں دندہ پھاڑ کھاتے ہیں۔ اور میت اس درندے کا جزو بدن بن جاتی ہے۔ بعض لوگ پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں تو آبی حیوانات کی غوراک بن کر ان کا جزو بدن بن جاتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی قبر یا بدن ہے جس کے ساتھ اس عرصہ موت میں روح کے اتصال کا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

اب اس سے بھی آگے بڑھیے کہ جو درندے یا آبی جانور کسی میت کی قبر بنے ہیں۔ وہ بھی بالآخر کر مٹی میں بل جائیں گے۔ تو قبر یا بدن والی آخر کونسی بات رہ جاتی ہے جس سے روح کا اتصال ہو؟ جب ہم یہ سوچتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کی لاش مٹی میں مل کر مٹی کے ذرات میں ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کلیہ میں اگر استثناء ہے تو صرف یہ کہ انبیاء و قبروں ہی میں دفن ہوتے ہیں۔ اور ان کے اجساد کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ جیسا کہ احادیثِ صریحہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ ایسے صلحاء بھی اس ضمن میں آ سکتے ہیں جن کے اجساد کو کھانا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے مگر اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ انبیاء کے اجساد کو زمین کیوں نہیں کھاتی؟ یہ ایک الگ بحث ہے جو خالص انبیاء سے تعلق رکھتی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

مندرجہ بالا تقریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی صورت جب تک اس کا جسد قبر میں بحال رہتا ہے، یا پھر قبر کے نشانات قائم رہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قبر کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے؛

”وَمَا أَنْتَ بِمُسْتَمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ“ (فاطر: ۲۲)

”اے محمد! آپ اُن لوگوں کو سنا نہیں سکتے جو قبروں میں ہیں“
اور دوسری حالت آخری حالت ہے۔ جبکہ نہ تو قبر کا نشان باقی رہ جاتا ہے اور نہ جسم کا، بلکہ وہ مٹی میں بیکری کر مٹی بن جاتا ہے۔ تو اس حالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”حدیث“ کا لفظ استعمال فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَكْسِبُونَ“ (۱۳۲)
”پھر جب سونے میں پھونکا جائے گا تو لوگ اپنی اپنی اجساد سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے“

گویا قیامت کے برپا ہونے کے وقت نفخہ زنی پھونکا جائے گا جس کا اثر یہ ہوگا کہ مٹی میں پڑے ہوئے ذرات فوراً متحرک ہو کر آپس میں مل کر جسم کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پھر ان اجسام کی رُو میں اُن میں مستقل طور پر داخل ہو جائیں گی۔ پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے میدانِ محشر کی طرف دوڑتے ہوئے پہنچ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ حدیث کی مندرت میں رُوح کا اتصال (اگرچہ عذابِ قبر کا عقلی ثبوت) وہ کبھی کبھار اور کمزور سا ہوتا ہے، ممکن بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ امارتِ محبوب سے اور قرآن سے بھی عذاب و ثوابِ قبر کا دوام ثابت ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی یہ ممکن ہے۔ کیونکہ جسم کے کسی ادنیٰ سے جیسے یا ذرے پر تکلیف سے رُوح متاثر ہو جاتی ہے۔ اور اب تو سائنس کے ہمدید استحکانات نے اس مسئلہ کو اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جسم کی ساخت میں غلیات کا کردار اور اُن کا بناؤ بجاڑ۔ نیز نفسا میں اُن کے پیدا شدہ انسانی اور غیر انسانی آوازوں کا محفوظ ہونا اور ان آوازوں کو الگ الگ کر لے کا امکان ایسی باتیں ہیں جو حدیث سے بعث بعد الموت کے امکان کو محسوس ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور اس بات کا بھی کہ ان ذرات سے رُوح کے اتصال کا امکان، ممکن ہے۔

عذابِ قبر کا تعلق رُوح اور بدن دونوں سے ہے | بدن یا جسم میں اگرچہ عقل و شعور اور ارادہ و اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ

۱۔ قبر اور حدیث کا یہ نفوی فرق شاید نعت کی کسی کتاب سے ذیل کے گایہ جو کچھ فرق میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم کے طریق بیان کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔

وہ ایک آلہ کار کی حیثیت سے رُوح کے نیک و با اعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہذا اس برزخی زندگی میں وہ بھی اپنی موجودگی کی مناسبت سے عذاب و ثواب میں شریک ہوتا ہے۔ اس برزخی زندگی میں رُوح تو مستقل طور پر زندہ رہتی ہے مگر بدن کو یہ پائیداری حاصل نہیں۔ لہذا اس عذاب و ثواب کا بیشتر حصہ رُوح ہی کے حصہ میں آتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ عرصہ موت ہے جس میں زندگی کے آثار بھی کچھ بھی ہوں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی زندگی میں خواب جیسی نیم زندگی ہونے کے باوجود اس عرصہ کا نام زندگی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں زندگی کے آثار زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ مرحلہ (دنیوی زندگی) میں موت (نیند) اور مرحلہ میں برزخی زندگی کے وجود کی طرف رسول اللہ کے درج ذیل ارشاد میں پوری طرح صراحت موجود ہے۔ فرمایا:

”الْكَافِرُ نِيَامٌ إِذَا مَاتَ وَإِنَّا نَكْبَهُ“

”لوگ سوتے ہوتے ہیں، جب مریں گے تو ان کے ہوش ٹھکانے رہ جائیں گے“

برزخی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے جتنی اس دنیا میں خواب کی ہے۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح کچھ ٹکھ سے دوچار ہوتی ہے۔ اور یہ سمجھتی ہے کہ وہ فی الواقعہ ان ولادات سے نجات ہے لیکن اس کے باوجود واقعات کی خارجی دنیا میں اس کا کچھ وجود نہیں ہوتا جیسا کہ برزخی کیفیت میں جہاں تک رُوح کے عذاب و ثواب کا تعلق ہے، وہ فی الواقعہ مکمل طور پر اس سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن خارجی دنیا میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے انسان دو ہی طرح کے ہیں، ایک مومن، دوسرے کافر مومن کے لیے قبر فراخ کر دی جاتی ہے اور کافر کے لیے قبر اتنی تنگ کر دی جاتی ہے کہ میت کی ہڈیاں ایک دوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور یہ واقعات میت کی تدفین کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس میت کی قبر کو اکھاڑ کر دیکھیں گے تو قبر کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

پھر جس طرح خواب میں بعض اوقات رُوح کے علاوہ بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ کے عذاب و ثواب میں بھی بعض دفعہ بدن پر اثر ہو جانا ممکن ہے۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبھی رُوح و بدن کا اتصال ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ مدت موت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر عذاب و ثواب قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے، آزمائش اور حساب کا فرق تو پھر آخرت میں اور کونسا حساب لینا باقی رہ جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں حساب نہیں لیا جاتا۔ صرف سرسری جانچ کی جاتی ہے۔ مگر نکیر آتے ہیں اور

تین بنیادی باتوں کے متعلق تین موٹے موٹے سوال پوچھتے ہیں۔ یہ گویا تہرہ سری سازِ بانی امتحانِ ہوتا ہے۔ جس سے میت کو دُنیا میں اپنی کارکردگی اور آئندہ زندگی میں ان اعمال کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں میت کو خوشی یا غمی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ قبر میں عذاب و ثواب کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ مومن کو جنت دکھلا دی جاتے اور اُسے جنت کی خوشخبری دے کر نہ صرف یہ کہ اُس کے ذہنی اطمینان و انبساط کا سامان مہیا کیا جائے بلکہ جنت کی کچھ ٹھنڈی بہت نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جائے۔ اور ان نعمتوں کی نسبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اس عرصہ موت کو زندگی سے نسبت ہے۔

۲۔ کافروں کو پہلے جنت دکھا کر پھر دوزخ پیش کی جاتے تاکہ ان کو مزید حسرت دیاں ہو۔ اور جہنمِ رمزی عذاب بھی پہنچایا جائے۔

۳۔ گنہگارِ مسلمان کو عذاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔ اور وہ بعثت بعد الموت کے جنت میں جانے کے قابل بن سکے۔ اور اگر وہ زیادہ گنہگار ہے تو آخرت میں اس گناہوں کے بدلہ میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے، جس حد تک وہ عذابِ قبر میں ٹھگت چکا ہے۔

اور حساب کا معاملہ آزمائش سے سخت اور شدید تر ہے۔ کیونکہ حساب اللہ تعالیٰ خود لیں گے ذیوی زندگی کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ کر حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی۔ اعمال کیلئے میزان ہوگا۔ شہادتیں مہیا کی جائیں گی۔ اور یہ سب میدانِ محشر میں اس چوتھے مرحلہ میں ہوگا۔ جس کا نام بعثت بعد المات یا اخروی زندگی ہے۔ جب نوح اور بدن متھل ہوں گے اور عذابِ ثواب کا اثر شدید، ہم گیر اور دائمی ہوگا۔

پھر اس حساب یا عدالتی انصاف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو محض اللہ کے حضور پیشی اور تہرہ سری پوچھ گچھ ہے۔ جو انصاف کے بجائے اللہ کی رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ لوگوں سے بالعموم اسی قسم کا حساب لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ رعائتی منبر سے کہ بھی پاس کرتے جاتیں گے۔ اور حساب کی یہی قسم ”حِسَابًا لِّیَسِّرَہَا“ کہلاتی ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کو دُعا سکھلائی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن بھی انصاف پر اُتر آئیں۔ اور ہر شخص کے اعمال کو یہی جنت میں داخلہ کا سبب قرار دیا جائے تو شاید کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے۔ اَللّٰہِ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے ڈھانپ لے۔

(ب) سماع موتی

سماع موتی کا مسئلہ عذاب قبر یا روح کی حقیقت کی طرح محض ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا سب سے بڑا چھوڑنا ہے۔ لہذا قرآن مجید نے سماع موتی کے تمام اسکاکی پہلوؤں کو پوری قوت سے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات قابل غور ہیں:

۱۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۝ (النحل: ۲۰، ۲۱)

”اور جنہیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خدا پیدا شدہ ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

۲۔ وَمَا يَسْتَوْفِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ يُنْعِمُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝ (فاطر: ۲۲)

”زندہ اور مرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تو جس کو چاہے نسا سکتا ہے لیکن (اے محمد) تم ان لوگوں کو نسا نہیں سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔“

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

۳۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ۝ (الاحقاف: ۲۵، ۲۶)

”اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو گا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب نہ دے سکے، بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روزِ قیامت) اکٹھے کئے جائیں گے تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے؟“

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ غائب یا فوت شدہ لوگوں کو پکارنا ان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ باغاط و دیگر شرک ہے۔

- ۲۔ غائب یا فوت شدہ لوگ کسی کی پکار کا جواب دینا تو درکنار ان کی بات سن بھی نہیں سکتے۔
 ۳۔ قبروں میں پڑے لوگ زندہ نہیں ہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں۔ انھیں اپنی ذات کے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔
 ۴۔ البتہ ایک استثنائی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مردوں کو سنا سکتا ہے اس کے علاوہ ان کے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

استثنائی صورت اب دیکھتے یہ استثنائی صورت وہی ہے جسے ہم دیوی زندگی میں خواب کی مثال میں پیش کر چکے ہیں۔ خواب میں بھی رُوح میں اپنی مرضی سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح میں آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتی اور ایک دوسرے کی سنتی بھی ہیں۔ لیکن سوا ہوا آدمی پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سُن سکتا۔ کیونکہ عالم خواب اور عالم دنیا اور عالم۔ اسی طرح مردہ لوگ جو عالم دنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم (عالم برزخ یا عالم مثال) میں ہوتے ہیں، وہ دنیا کے لوگوں کی باتیں کیونکر سُن سکتے ہیں؟ عام ضابطہ الہی یہی ہے کہ مرنے والی بات سُن نہیں سکتے۔ اب دیکھئے کہ :

استثنائی صورتوں کے نتائج (۱) دوبارہ زندگی اور دوبارہ موت ایک عام ضابطہ الہی ہے مگر مرحلہ میں مردوں کا زندہ ہونا استثنائی صورت ہے۔ جسے چند عقل پرستوں یا نیچر پرستوں کے علاوہ سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔
 ۲۔ اسی مرحلہ یا دیوی زندگی میں دوسری استثنائی صورت خواب یا نیم موت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے اور چونکہ یہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ خواب میں چونکہ موت کے اثرات بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ لہذا یہ نیند کا عرصہ بھی حیات ہی میں شمار ہوتا ہے۔

۳۔ مرحلہ عطا یعنی مرنے سے یوم البعث کے عرصہ کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ اس میں بھی زندگی کے ہلکے سے آثار پاتے جلتے ہیں۔ قبر کے عذاب کا ثبوت قرآن سے بھی ملتا ہے۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی واضح طور پر ثابت ہے۔ اس استثنائی صورت کو بھی سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ منکرین حدیث کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے قرآن کی آیات کی تاویل کر لی۔ اور احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس استثنائی صورت کا

انکار کر دیا۔

۴۔ مسئلہ میں دوسری استثنائی صورت سماعِ موتی ہے۔ اس کے متعلق عام ملاحظہ الہی یہی ہے کہ مرنے سن نہیں سکتے۔ اور استثنائی صورت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مرنے کو ٹٹا سکتا ہے۔ پھر کچھ عادیث صحیحہ بھی ایسی ہیں جن میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے سن سکتے ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں امت میں اختلاف واقع ہوا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرنِ اول میں بھی اختلاف موجود تھا۔ مثلاً حضرت قتادہؓ اور حضرت عائشہؓ تو سماعِ موتی کے منکر تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتی کے قائل تھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ صحابہؓ میں اختلاف سننے کی حد تک تھا۔ یہ بات قطعاً مختلف فیہ نہیں تھی کہ وہ سب کہ جواب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر آج یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے سماعِ موتی کے قائلین صرف یہی نہیں کہتے کہ مرنے سن سکتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرنے اہل دنیا کی بات سن کر جواب بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں سائل کی حاجت برآری کرنے کی قدرت اور تعریف بھی رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ گروہِ مونیہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا بیری مریدی کا سلسلہ ان اعتقادات کے بغیر چلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم سرِ دوستِ مردوں کے جواب دینے اور حجت برآری کرنے کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سماعِ موتی کی حد تک ان قائلین کے دلائل کا ہاتھ پیر کر رہے ہیں :

سماعِ موتی کے قائلین کا طریق استدلال

قرآن مجید چونکہ سماعِ موتی کی سخت اور کٹی تہذیب کے خلاف ہے اس لیے یہ حضرات ایسی تمام آیات کی تائید کر جاتے ہیں جو سماعِ موتی کی تردید کرتی ہیں۔ مثلاً :

(ا) موتی سے مراد حقیقی مرنے نہیں بلکہ دل کے مردہ یا کافر لوگ ہیں اور ان کو ٹٹا نہیں سکتے۔
 کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں راہِ راست پر نہیں لاسکتے اور اللہ کے سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی انھیں راہِ راست پر لاسکتا ہے۔

(ب) جن بے جان ہستیوں کے پکارنے کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے مراد بزرگ نہیں بلکہ وہ اصنام یا شمس و قمر اور مظاہرِ قدرت ہیں جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ یہی وہ

چیزیں ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں۔ اور بے جان اور بے شعور ہیں۔ رہے بزرگ
تو ان کی زندگی میں جب ان کی پرستش ہی نہیں ہوئی تو ان آیات سے یہ بزرگ کیسے مراد
لئے جاسکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

تاویلات کا جائزہ | یہ تو واضح ہے کہ آج تک عبادت یا قربانیوں کی ہوتی رہی ہے یا مظاہر
قدرت کی جیسے شمس و قمر، ہوا، پانی، آگ اور درخت وغیرہ یا جنوں اور
فرشتوں کی یا پھر فوت شدہ بزرگوں کی۔ یہ بزرگ گواہی زندگی میں اپنی عبادت سے منع کرتے رہے
مگر جب لوگوں نے ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر پکارنا شروع کیا تو ان کی اسی پکار کو قرآن
نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف پوجا پاٹ نہیں ہوتا بلکہ کسی کو نفع پہنچانے
یا نقصان سے بچانے کے لیے پکارنا ہی عین عبادت اور اس میں شامل ہے۔ اور بالعموم انہی دو
باتوں کے لیے کسی کو پکارا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ :

۱۔ آیت میں "اموات غیر اخیار" کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر، اور الفاظ
"بعث بعد الموت" کا اطلاق جنوں یا دیگر مظاہر قدرت پر نہیں ہو سکتا۔ اب باقی صرف
فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔
۲۔ آیت میں گوشتی سے مراد مردہ منمیر کا فرض لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس آیت یا سیاق و
سباق میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر یہ مجازی معانی اختیار
کئے جائیں۔

۳۔ آیت میں "وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ" کے الفاظ کو جنوں اور فرشتوں کو معبودان
باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دُعائے من سکتے ہیں۔ اور "كَانُوا لَكُمْ اَعْدَاءُ"
کے الفاظ جنوں اور مظاہر قدرت کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ کیونکہ
ان بے جان اشیاء کے نہ اس دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ ہے نہ آخرت میں ان کی دشمنی کا کچھ
نقصان۔ بلکہ ان چیزوں کا تو آخرت میں کوئی دعوہ ہی نہ ہوگا۔ اب صرف فوت شدہ بزرگ
ہی رہ جاتے ہیں۔ جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

(۲) احادیث صحیحہ | احادیث صحیحہ کے مضمون کے طور پر چار باتیں سامنے آتی ہیں،
۱۔ نبی اکرم پر صلوٰۃ و سلام بھیجا۔

۲۔ قلیب بدر کا واقعہ۔

- ۳۔ مٹے کا تدفین کے بعد واپس جانے والوں کے قدموں کی چاپ چھٹنا۔ اور
۴۔ قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو اسلام علیکم دار قوم تو منین وغیرہ کہنے کا ارشاد نبویؐ۔ ان باتوں میں سماع موٹی کا احتمال موجود ہے۔ گویا احادیث صحیحہ چونکہ قائلین اور منکرین سماع کے درمیان مشترک ہیں۔ لہذا ان کا ذکر ہم منکرین سماع موٹی کے دلائل میں پیش کریں گے۔

(۳) تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث | ایسی احادیث میں سماع موٹی کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اور یہی احادیث دراصل سماع موٹی کے

کے قائلین کے لیے رکن شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ احادیث تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابل احتجاج نہیں ہوتیں۔ شان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا ان پر تبصرہ کرنا بیکار اور خارج از بحث ہے۔ اس طرح کی ایک دوا احادیث کا ذکر آئندہ چل کر آئے گا۔ جو ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود بہت مشہور ہیں۔

(۴) بزرگوں کے اقوال | بزرگوں کے اقوال نے تو سماع موٹی کی بنیاد پر ایک قہر عظیم تیار کر دیا ہے۔ یہ بزرگ مڑوں کو یوں زندہ کرتے ہیں کہ حضرت

علیؑ کا معجزہ ان کی کرامات کے سامنے بیچ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مڑوں کو زندہ کرنے کا امکان ہے مگر ان حضرات نے تو اس امکان کو اتنا عام کیا کہ عام منابط اور استثنائیں کوئی فرق ہی نہ چھوڑا۔ مولانا سودی صاحبؒ نے کہا تھا کہ مسلمان کی عادت سی بن گئی ہے کہ جہاں انھیں سوتی کے ناکر بتنی گنجائش ملی وہاں سے وہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی صورت حال ان لوگوں کی بھی ہے۔ سماع موٹی، حاجت، بآری اور تعقبات امور میں ان کا دخل اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم تر نہیں ہوتا۔ اگرچہ زبان سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت کے متبع ہیں۔ یہ مباحث اس موقع پر خارج از بحث ہیں۔ سروسست ہم یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بزرگوں کے ان اقوال اور خوالوں کو ان کے بعض معتقدین بھی محبت نہیں سمجھتے۔ تو ان کو زیر بحث لانا بالکل بیکار ہے۔

منکرین سماع موٹی اور ان کے دلائل

- ۱۔ قرآن | قرآن میں مذکورہ بالا تین آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے ملے ان کا ذکر ہم نے اپنی تصنیف "اسمیت و طریقت" میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے جو زیر طبع ہے۔

سماحِ موتی کا رد ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم توں کہیں گے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مرحلہ بہ مرحلہ یعنی برزخی زندگی میں مُردوں کے متعلق عام ضابطہ الہی یہی ہے کہ وہ سن نہیں سکتے۔ اس طرح کی مزید آیات کا اندازِ طوالت کا باعث ہوگا۔ مقصد برآری کے لیے یہی تین آیات کافی ہیں، جو دہج کی جا چکی ہیں۔

۲۔ احادیث صحیحہ

(۱) **مقتولین بدر** | قلیب بدر یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقتولین بدر کے خطاب کا واقعہ تقریباً تمام کتب صحاح میں موجود ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف صحیح بخاری سے تین روایات نقل کریں گے (ایک حدیث کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ دوسری کے حضرت قتادہؓ اور تیسری کی حضرت عائشہؓ) تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ امام بخاریؒ نے یہ احادیث کتاب المغازی (غزوہ بدر) میں دہج فرمائی ہیں اور کتاب الجنائز باب ما جاز فی عذاب القبر میں بھی۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

”أَظْلَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَهْلِ الْقَدِيبِ فَقَالَ: وَجَدْتُمْ مِمَّا وَعَدَ اللَّهُ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَقِيلَ لَهُ: أَتَدْعُو أَمْوَاتًا؟ قَالَ: مَا أَنْتُمْ بِمَعْمُومِيهِمْ وَلَكِنْ لَا يُجِيبُونَ“

”جو کافر بدر کے دن اندھے کنویں میں ڈال دیتے گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر جہاننکا اور فرمایا۔ ”تمھارے مالک نے جو سچا وعدہ تم سے کیا تھا وہ تم نے پایا؟ لوگوں نے عرض کیا: ”آپؐ مُردوں کو پکارتے ہیں؟“ فرمایا ”تم کچھ اُن سے زیادہ نہیں سنتے۔ البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے۔“

(ب) حضرت قتادہؓ، انسؓ اور وہ ابو طلحہ انصاریؓ سے یہی واقعہ روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

”قَالَ قَتَادَةُ: أَحْيَاهُمُ اللَّهُ حَتَّى أَسْمَعَهُمْ قَوْلَهُ كَوَيْبِهَا وَكَصَفِهَا وَنَفْسَهُ وَحَسْرَةً وَنَدَامًا۔ (بخاری کتاب المغازی، ابواب غزوہ بدر)“

”قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ کہا کہ اللہ نے اُس وقت اُن مُردوں کو حیاتِ

تھا۔ اُن کو درجہ ترویج کرنے، ذیل کرنے، بدل لینے، افسوس دلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے ؟

(ج) حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم یا اس اجتہاد کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ عبداللہ مجھول گئے۔ (نسائی۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر) اور خود اس واقعہ کے متعلق فرمایا :

”قَالَتْ اِنَّمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْلَهُمْ يَفْقَهُونَ اِلَّا اَنْ مَا كُنْتُ اَقُولُ لَمْ يَحْقُوقْ وَكَذَلِكَ قَالَ اللهُ تَعَالَى اِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى ؟“ (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ما جاز فی عذاب القبر)

”حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کافروں کو صرف یہ کہا تھا کہ : میں جو ان سے کہا کرتا تھا اب ان کو معلوم ہو گا کہ وہ سچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ نوح میں) فرمایا کہ اے پیغمبر تو مومنوں کو سنا نہیں سکتا ؟ ان ہر سہ امادیت سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتی کے قائل تھے۔ گواہوں نے بھی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ تاہم اُن کا یہ عمل تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہؐ پر، حضرت ابوبکرؓ پر اور اپنے باپ حضرت عمرؓ پر سلام کہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سماعِ موتی کے قائل تھے۔

۲۔ گواہ آپؐ سماعِ موتی کو درست سمجھتے تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے ؟ گویا اُن کے نزدیک بھی یہ سلام، سلامِ دعا یا سلامتی کی دعا نہ تھا، سلامِ تحیہ نہ تھا، جس کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہؓ اس واقعہ کو نبی اکرمؐ کا معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کافروں کی زجر و ترویج اور حسرت و دلدامت دلانے کے لیے کہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی رُو میں ٹوٹا دی، تاکہ وہ یہ الفاظ سن لیں۔ یا اللہ نے براہِ راست اُن کی رُوں تک یہ الفاظ پہنچا دیئے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سماعِ موتی کی اس حد تک انکاری ہیں کہ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم کا رد بھی کیا۔ آپؐ بھی اس واقعہ کو ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اُن کے خیال میں

ان مَرُودوں کو سنا دینا اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی توجیہ وہی بیان فرمائی جو حضرت قتادہ نے فرمائی۔

اب دیکھئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک عہد گزار، زاہد، متقی
حضرت عائشہؓ کا تفقہ اور صالح انسان ضرور تھے۔ مگر تفقہ میں انہیں وہ مقام حاصل
 نہ تھا جو حضرت عائشہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے میل القدر صحابہؓ مسائل
 دریافت کرنے آتے تھے۔ ترمذی کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

”عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: مَا اشْتَكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابُ
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا
 وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا“ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب مناقبہ رابع النبی)
 ”ابو موسیٰ اشعرثی سے روایت ہے کہ جب بھی ہم اصحاب رسول اللہ میں کسی حدیث
 کے متعلق اشکال پیدا ہوتا تو ہم اُسے حضرت عائشہؓ سے حل کر لے کر آتے تو ہمیشہ
 آپ کے پاس اس حدیث کا علم پایا کرتے۔“

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تفقہ کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے ان کے بارے
 میں تعلیف نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:

”وَاللَّهِ مَا أَرَدْتُ بِهَذَا، وَبِحَاكِ كَيْفَ اسْتَخْلَعُ دَجَلًا عَجِزَ عَنْ
 طَلَاقِ امْرَأَتِهِ“ (بخاری، تواتر ابواب طلاق)

”خدا کی قسم! میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ تجھ پر افسوس! کیا میں ایسے
 شخص کو اپنا جانشین بنا جاؤں، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بھی
 نہیں آتا۔“

اس تقابل سے نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شان کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ آپ
 کو خود رسول اللہ نے ”صالح آدمی“ کہا اور عہد پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اُن کی یہ فضیلت اپنے
 مقام پر ہے لیکن جہاں تک قوت اجتہاد کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کا مقام اُن سے بہت
 بلند تھا۔

گویا حضرت عائشہؓ کے اجتہاد کے مطابق رسول اللہ کے یہ کلمات زجر و توہین اور صحت و

افسوس دلانے کے طور پر کہے۔ جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دریا میں تیرنے سے منع کرتا ہے۔ مگر بیٹا اس کام سے باز نہ آئے اور دریا میں ڈوب کر مر جاتے۔ پھر اس کی لاش باپ کے سامنے آئے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تجھے نہ کہا تھا کہ یہ کام نہ کرنا در نہ مر جاؤ گے۔ گویا یہ کلمات زجر و توبیخ کے طور پر رسول اللہ نے کہے اور اعجاز کے طور پر اللہ نے یہ کلمات ان مقتولین بدر کو سنوا دیئے۔

۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا | احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ”مسلمان جب قبرستان بائیں تو اَللّٰمَ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْقُبُورِ یَا اَللّٰمَ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْحٍ وَ قَوْمِینَ“ کہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جو ساریع موتی کے قائلین کی طرف سے بڑے فتوے سے پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی خاص واقعہ سے بھی متعلق نہیں۔ ساریع موتی کا انکار کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ یہ سلام، سلامتی کی دعا ہے، سلام تحیہ ہے ہی نہیں جو سنا جا سکتا ہو اور جس کا جواب دینا فرض ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی موقف تھا۔ اس کی مثال بھی یونہی سمجھئے جیسے تشہد میں رسول اللہ پر سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا کوئی خط لکھنے والا ابتداء میں السلام علیکم کے خطاب کرتا ہے۔ اس سلام کا فوری جواب دینا تو درکنار جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی جواب دینا بھی نہیں آتا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب رسول اللہ پڑھتا ہوا سلام بھی اٹھو رہے نہیں سنتے بلکہ فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام مسلمانوں پر بھیجا ہوا سلام از خود ان تک پہنچ جائے اور وہ اُسے سن سکیں۔ ایسے سلام بھی بذریعہ خدا تعالیٰ ہی اُن تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ جو تلوں کی چاپ | دوسرا واقعہ جس سے ساریع موتی کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب میت کو اس کے عزیز و اقارب و دفن کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو مردہ ان کے جوتلوں کی چاپ سنتا ہے۔

یہ واقعہ بھی بکھرا ملا بیٹھ صحاح میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے اسے کتاب الجنائز باب ما بار فی عذاب القبر میں دو مقامات پر اس طرح درج فرمایا ہے:

”اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا مَاتَ عَبْدٌ وَ وُضِعَ فِي قَبْرِہِ تَوَلَّی عَنْہُ اَصْحَابُہٗ اِنْہٗ لَیَسْمَعُ کَرَمَ نِعَالِہُمْ اَتَاہُ مَلٰکِیْنِ فِیَقْعِدَانِہُ فِیَقُولَانِ (الحديث)

”رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے قبر میں لکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اُسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو وہ اُن کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے بٹھلا دیتے ہیں پھر کہتے ہیں:..... (الحدیث)

اب مشکل یہ ہے کہ مردہ کے جوتوں کی چاپ سننے کا واقعہ بخاری کے علاوہ بخاری کتب صحاح میں جہاں بھی مذکور ہے تو ساتھ ہی منکر نکیر کے آنے اور سوال و جواب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منکر نکیر کے آنے سے عقوذی دیر پہلے اُس کی روح علقین یا سقین سے لٹا کر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے، تاکہ وہ سوالوں کے جواب دے سکے۔ اب یہ سوال و جواب کا واقعہ تو ایک اضطرابی امر ہے اور خاص اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پھر کسی حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ وہ ان اصحاب کی باتیں بھی سنتا ہے جو اس خاص واقعہ سے علی الاطلاق سماع موتی کیسے ثابت کی جاسکتا ہے؟

اور دوسری مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ سے بھی حسرت و افسوس کا احساس دلانے کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جب عزیز و اقارب میت کو دفن کو کے پٹے ملتے ہیں، تو اُسے یہ احساس لایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تو مارا مارا پھرتا تھا، حتیٰ کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ دیکھ وہ اب تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہذا اُسے مروت ملتے والوں کی آہٹ تو سنا دی جاتی ہے، آنے والوں کی نہیں۔ اور نہ ہی قبر پر موجود لوگوں کی گفتگو اُسے سنائی جاتی ہے نہ ہی وہ سن سکتا ہے۔

(۱) لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُورًا وَلَا تَكْفُلُوا

قُبُورَ عِبَادٍ وَصَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ

۴۔ حضور اکرم پر صلوٰۃ و سلام

تَبْلُغُنِي حَيْثُ كُنْتُ؟

”اپنے گھروں کو قبروں نہ بناؤ (یعنی اُن میں نفل و نوافل پڑھا کرو) اور میری قبر کو جشن اجتماع نہ بناؤ اور مجھ پر دُود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمہارا دُود مجھے پہنچا دیا جاتا، جہاں کہیں تم ہو یعنی قبر کے نزدیک ہو یا دُور۔

اور سنائی میں اس دُود کو پہنچانے کی تفصیل یوں بیان کی گئی کہ:

(۲) إِنَّ اللَّهَ مَلِكٌ سَيَّاحٌ فِي الْأَرْضِ يَبْغُوْنِي مِنْ أَمْتِي الْقَلَامُ؟

”اللہ تعالیٰ نے رُوحے زمین پر سیریل فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو میری امت کا سلام بھی تک پہنچاتے ہیں؟“

اسی طرح دوسری کتب احادیث میں بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ جو باوجود اختلاف الفاظ کے اس مضمون میں مشترک ہیں کہ امت کا صلوة و سلام فرشتوں کے ذریعہ بھی اکرم تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ چاہے کہیں سے بھی پڑھا جائے ؟

یہ سب احادیث سماعِ موثق تو درکنار اس کا خلاف ثابت کر رہی ہیں۔
 علاوہ ازیں ایک روایت مشکوٰۃ (کتاب القلوة علی النبی بعد التشہد فصل ثانی بحوالہ ابی داؤد) اور بیہقی فی الدعوات اکبیر (کتاب النبی ص ۱۰۰) میں بھی آئی ہے :

۱۔ مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَى الْآلَةِ اللَّهُ عَلَى رُوحِي حَتَّى ارْتَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ
 ”جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ میری رُوح مجھ پر لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں ؟“

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

- ۱۔ رسول اللہؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے)۔ آپؐ کی رُوح اعلیٰ علیین میں ہے، جہاں سے وہ سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے۔ مگر آپؐ قبر میں زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹنے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔
- ۲۔ رُوح سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے سلام سننے کے لیے نہیں۔ کیونکہ مَدْرَج بالا احادیث کی رُوح سے سلام تو آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا ہی دیا جاتا ہے۔ آپؐ ان جمع شدہ سب سلاموں کا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ آپؐ کی رُوح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اور آپؐ جواب دیتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ اور عام افراد امت میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے جسم مٹی پر حرام قرار دے گئے ہیں اور یہ بات خُصائصِ انبیاءؑ میں سے ہے۔ پھر جب آپؐ پر سلام کا جواب کی یہ صورت ہو تو دوسروں پر اگر سلام پڑھا یا دعا کی جاتے تو ان کا سُنا اور جواب دینا ناممکن نظر آتا ہے۔ علی الاطلاق سماعِ موثق کا قبول کرنا پھر بھی محال ہے۔

اب رہا وہ سلام جو نمازیں تشہد کے دوران پڑھا جاتا ہے تو یہ سلام خطابِ سلام تشہد | سلام تحیہ ہے ہی نہیں۔ نہ ایسے سلام کو حضورؐ نے سنا، نہ کہیں اس کا جواب دیا۔

نہ نماز میں نہ نماز کے بعد۔ حتیٰ کہ جب صحابہ سیکھنے کی غرض سے اونچی آواز سے یہ سلام رسول اللہ کے سامنے پڑھتے یا "السلام علیک ایہا النبی" کہتے تھے۔ جب بھی آپ نے اس کا کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہ سلام بطور حکایت چھا جاتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب رسول اللہ کی ذات ہے۔ واقعہ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فرمایا "السلام علیک ایہا النبی" اور اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ "السلام علیک اوعلیٰ عبد اللہ الصالحین" تو یہ کلمہ بعینہ نماز میں بطور حکم پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام دُعا کے طہر پر ہے جس کا سننے سننے یا جواب دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے علاوہ بیہقی فی شعب الایمان میں ایک روایت یوں بھی آئی
موضوع احادیث ہے۔ جو عوام میں مشہور ہے، نیز یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ، باب

الصلوٰۃ علی النبی فصل ثلث میں بھی درج ہے :

سَمِعْتُ صَلَّى عَلَىَّ عِنْدَ قَبْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ

"جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام پڑھے تو میں اس سلام کو سن لیتا ہوں۔"

یہ روایت موضوع یا من گھڑت ہے۔ اس کا راوی محمد بن مروان السدی کذاب ابو صناع ہے جس کا کام ہی جھوٹی حدیثیں گھڑنا تھا۔ امام بیہقی نے اسی وصناع سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس سعادت کی خود ہی تردید کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں :

سَمَاعِنَ عَبْدٌ يُسَلِّمُ عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَكَلَّمَ اللَّهُ بِهِ مَلَكًا يَدُلُّنِي

"جب بھی کوئی شخص میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ

ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس سلام کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے۔"

گویا اصل ما بہ النزاع مسئلہ کا اس وصناع نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ اس کی دوسری حدیث پختہ دوسری صحیح احادیث کے مطابق ہے لہذا فرمان ہوئی "إِنَّ الْكَذَّابَ قَدْ يَصْدُقُ" کے مصداق اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام خواہ قبر پر پڑھا جائے یا دُور سے۔ آپ کو فرشتوں ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

واضع رہے کہ :

نقد و نظر (۱) صحیحین کی احادیث اقل درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ باقی صحاح کی چار کتابوں کی آمد دوم درجہ کی اور باقی کتب احادیث کی روایات علی قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی اکثر احادیث ناقابل اعتماد ہیں۔

۲۔ مشکوٰۃ حدیث کی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ مختلف کتبِ امارت سے منتخب مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین پہلے امام حسین بن سعید البغوی نے علاوہ میں کی۔ اور اس کا نام مصابیح السنۃ مجوزہ کیا۔ اس میں ہر باب کی تفصیل رکھیں۔ پہلی فصل میں صحیحین کی امارت درج کریں۔ اور دوسری میں باقی چار صحاح کی کتابوں کی۔ پھر امام محمد بن عبداللہ الخطیب نے انھوں میں اس کو از سر نو مدقن کیا۔ اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ اور اس میں ہر باب کے بعد ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا۔ اور اس میں بلا امتیاز جو حدیث ملی، درج کر دی۔ خواہ یہ درجہ اول یا دوم سے تعلق رکھتی ہو اور پہلے درج نہ ہوئی۔ اور خواہ یہ حدیث درجہ سوم اور چہارم سے تعلق رکھتی ہو۔

۳۔ حدیث **رَدُّ الْمَعْلُومِ** (مجتہد) میں یہی کہے کے ساتھ چونکہ ابوداؤد کا حوالہ بھی آگیا ہے۔ لہذا یہ تفصیل ثانی میں درج کر دی گئی اور موضوع حدیث **ع** کا فصل ثالث میں اندراج بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح **مرآۃ المفاتیح** مولانا عبید اللہ رحمانی نے لکھی ہے۔ انھوں نے حدیث **سنن ۹۳** (یعنی ہماری مندرجہ حدیث **سنن**) پر جو حواشی لکھے ہیں، ان کا لکھنا یہ ہے۔ (مرآۃ المفاتیح جز ثانی مطبوعہ مکتبہ اثریہ ساکنہ بیل ص ۵۵ و ۵۶)۔

۵۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ سلام نزدیک دُور یا دُور کے کسی جمعہ سے آپؐ پر بھیجا جائے وہ تمام صحیح اور مشہور امارت کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ آپؐ تک پہنچایا جاتا ہے۔

۶۔ میرے (شایع کے) خیال میں راجع بات یہ ہے کہ یہ سلام دعا ہے سلام تحیہ نہیں۔
۷۔ اس حدیث **”سَمِعْتُ“** والی کی سند یوں ہے۔ العلاء بن عمرو۔ محمد بن مروان السدی۔ اُمّ ش۔ ابی صالح۔ ابی ہریرہ مرفوعاً۔

عقیلی کہتے ہیں کہ:

۱۔ اُمّ ش والی حدیث کا کچھ اصل نہیں۔

۲۔ العلاء بن عمرو کے تعلق ابنِ حبان اور لازدی نے کہا کہ یہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور

۳۔ محمد بن مروان السدی متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔

موضوع حدیث **ع** | ابنِ عبدالبر نے الاستذکار والتبیین میں ابنِ عباس سے

روایت کیا کہ:

”مَنْ أَحَدٍ قَبَّرَ أَخِيهِ الْمُؤْمِنَ كَانَ يَعْرِفُهُ فِي الدُّنْيَا يُسَلِّمُ عَلَيْهِ
الْآخِرَةَ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“

”کوئی بھی شخص جو اپنے مومن بھائی کی قبر پر گزرتا ہے وہ دنیا میں پہچانتا تھا جب
یہ عمر بنے والا شخص اس کو سلام کہتا ہے تو وہ اسے پہچان لیتا ہے اور وہ سلام کا جواب
دیتا ہے“

اور اسی مضمون سے طبری جلیقی حدیث ابن ابی الدنیائے نمینہ اسلم سے۔ ابو ہریرہ سے
کتاب القبور میں یوں بیان کی:

”إِذَا امَّا الرَّجُلُ يَقْبِرُ يَعْرِفُهُ قَبْلَهُ عَلَيْهِ رَدُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَخَرَفَةٌ
وَإِذَا امَّا يَقْبِرُ لَا يَعْرِفُهُ فَسَلِّمُ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ“

(معراج المصابیح - ج ۲ - ص ۵۵ سے نقل کی گئی)

علمائے دین اور سماع موٹی | اس حدیث کے متعلق مستفسر جناب عبدالقادر سمرود
نے استفسار فرمایا۔ یہ حدیث امام ابن تیمیہؒ نے کتاب
الوسيلة (ترجمہ ص ۱۲۳) میں درج فرمائی۔ اور امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب کتاب الروح پچھلے باب
میں ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ (کتاب الروح - ترجمہ از محمد داؤد
راغب رحمانی، مطبوعہ نفیس الیٹمی کراچی ص ۲۵) اس حدیث کے مرود ہونے کے لیے یہی بات
کافی ہے کہ اس کتاب کے مترجم ابو داؤد و راغب رحمانی نے اسی کتاب کے مکتبہ پر ضروری بات
کے تحت یہ صراحت فرمادی کہ ”ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں“ لطف
بات ہے کہ ایک صغوم پر مترجم یہ ضروری بات لکھتے ہیں۔ اور سامنے صفحہ پڑھی ابن ابی الدنیا کی
یہ روایت بل جاتی ہے۔ جس سے امام ابن قیمؒ نے احتجاج کیا ہے۔

مستفسر جناب محمد احسان الحق صاحب نے یہ سوال بھی (رسول ص ۱۷) کیا تھا کہ کتاب الروح
(ابن قیمؒ) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ امام ابن قیمؒ اور ان کے استاد جناب
امام ابن تیمیہؒ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ سماع موٹی کے قابل تھے بلکہ اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق
رکھتے تھے۔ جنہوں نے اس مسئلہ کو اچھالا اور ضعیف اور موقوف احادیث کا سہارا لے کر اس
مسئلہ کو علی الاطلاق ثابت کرنا چاہا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ دونوں صاحب کشف و کرات

بھی تھے۔ اُردو دونوں بزرگوں نے تعفون و سلوک پر منتقل کیا میں بھی کبھی ہیں۔ اُردو یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر اس طبقہ کے منجھ سے قبر اندر سماع موٹی کے مسئلہ کو کھینچ لیا جائے تو اُن کے پاس باقی رہ کیا جاتا ہے؟

اسی طرح کے ایک تیسرے بزرگ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جب شرک و بدعات کی تردید پر قلم اٹھاتے ہیں، تو جی عش عش کر اٹھتا ہے۔ اُردو ہم دل و جان سے اُن کی دینی خدمات کے معترف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ زیارات قبور کے آداب اور کشف کے طریق بتلائے گئے تو نہیں سوچتے کہ آیا قبروں اور مزارات کے وجود کا بھی کوئی حراز ہے یا نہیں یا قبروں پر اس غرض سے بیٹھنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ مُردوں کو سنانا اور اُن سے مسنا تو مُردہ کی باتیں ہیں۔ ان سب باتوں کی کتاب و سنت نے پُر زور تردید کر دی ہے۔

یہ تو خیر مفسرین کے سوالوں کے جواب تھے۔ اب زیر بحث حدیث کی طرف آئیے۔ جو یہ کہتی ہے کہ مُردہ اگر سلام کہنے والے کو پہچانتا ہے۔ تو جواباً اس پر سلام بھی کہتا ہے۔ اور اگر نہیں پہچانتا تو صرف اسے لوٹا دیتا ہے۔ اُردو ای طرح بعض دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ مُردہ اپنے واقف کے آنے سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے بار بار آنے پہلنے سے اُنوس ہو جاتا ہے۔

اب ایسی احادیث سے صحت ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

جملی حدیث کے نتائج | (۱) قبرستان میں ہر طرف مُردے ہی نہیں بلکہ رُوحیں بھی ہر وقت موجود رہتی ہیں اور وہ ان کے بدنوں میں ہوتی ہیں (عینین یا عینیں میں نہیں ہوتیں)۔

(۲) ان مُردوں میں شعور بھی ہوتا ہے اور شعور کا تعلق روح سے ہے بدن سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مُردوں کے اجسام میں رُوحیں موجود ہوتی ہیں۔ یعنی وہ قبوں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۳) وہ سلام وغیرہ سنتے ہی نہیں بلکہ اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سوال و جواب قبر پر ہوتا ہے۔ لہذا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبروں میں مُردے نہیں بلکہ زندہ اُردو باشعور انسان تشریف رکھتے ہیں۔

اُردو یہی وہ بنیاد ہے جس کی طبقہ موفیا کو ضرورت تھی۔ لیکن قرآن ان کی ایک ایک بات کی پُر زور تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ زور موت کا دُور ہے زندگی کا نہیں۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ مُردہ ہیں، نہ اُن میں شعور ہے، نہ یہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ اب دُعا

لاستے ہیں۔ یا تو ان اماموں اور بزرگوں کی روایات اور اقوال اور کاشفات کو مان لیجئے اور قرآن و مستحواں ہو جائیے۔ ورنہ ان سب خلافات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جو استثنائی قدرت بیان فرمائی کہ ”اللہ اگر چاہے تو مردوں کو تار سکتا ہے۔“ اس مستثنیہ سے اس قدر گنجائش نکالنا کہ قرآنی تعلیمات کے بالکل برعکس ہو جائے۔ آخر کہاں تک گوارا کیا جاسکتا ہے؟

کتاب المزوج اور سماع موثق | اس کتاب کا آغاز سماع موثق پر بحث سے ہوتا ہے۔ لیکن ترقن کی کوئی آیت درج نہیں۔ آغاز کتاب ابن عبد البر کی اس روایت سے ہوتا ہے جسے ہم نے موضوع حدیث کے تحت درج کیا ہے۔ اس کے بعد قلیب بدالی حدیث درج ضرور ہے۔ لیکن اس پر حضرت قتادہ یا حضرت عائشہ کا تھوڑا چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعد ازاں ”السلام علیکم ذاکم مؤمن منین“ کی روایت درج ہے۔ اور پھر ابن ابی الدنیا کی روایات مذکور ہیں۔ جس کے متعلق کتاب الترویج کے مترجم محمد داؤد و انغب رحمانی پہلے ہی مطلع کر چکے ہیں کہ ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں۔ یہ پانچ روایات درج کرنے کے بعد بزرگوں کے اقوال اور خوابوں کے واقعات کا لاغتصابی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس سے آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ کتاب و سنت کے معیار پر یہ کس قدر تحقیقی کتاب کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

امام ابو حنیفہ | حیرت کی بات ہے کہ سماع موثق اور اسی طرح سلوک و تصوف خفیوں و ملاوہ بالخصوص بریلوی طبقہ میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہ سماع موثق کے سخت مخالف تھے۔ آپ کے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے کسی شخص کو ایک قبر پر صاحب قبر کو جارتے دیکھا تو کہنے لگے:

”تجھ پر چٹکار ہوا اور تیرے ہاتھ خاک آلود ہیں، تو ایسے جہاد سے بات کرتا

ہے جو آواز سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ اختیار رکھتے ہیں؟

پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: ”وَمَا أَنْتَ بِمُتَّبِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ“

ہاں ہمہ سماع موثق کی بنیاد پر پھیلنے والے دوسرے شرکیہ عقائد کی سرپرستی کا حق جس

قدر فرقہ بریلویہ نے ادا کیا ہے کسی نے کم ہی کیا ہو گا۔ دوسرے نمبر پر دیوبندی حضرات میں اُردو ہمیں افسوس ہے کہ اجماع حدیث بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے۔ جتنے دسی انھوں نے بھی یہ

حق ادا کر ہی رہا۔

علامہ وحید الزمان | متاخرین میں ایک عالم شخصیت علامہ وحید الزمان ہیں۔ یہ پہلے شیعہ تھے، پھر حنفی ہوئے۔ پھر اہلحدیث ہوئے۔ تاہم کچھ نہ کچھ سابقہ اثرات طبیعت میں باقی رہ ہی گئے۔ مثلاً آپ آخر عمر تک فضیلتِ ملّی کے قائل رہے۔ اور جہاں کہیں یزید کا نام آیا تو یزید پر پلید لکھا۔ آپ جب حنفی تھے تو سماعِ موثق کے قائل تھے۔ اہلحدیث ہوئے تو بھی قائل ہی رہے۔ پھر اس سماعِ موثق کے مسئلہ میں آپ کو امام ابن تیمیہ اور ابن قیم سے تائید بھی مل گئی۔ تو اس سماعِ موثق کے جواز کا خوب پرچار کیا۔ آپ نے قرآن کی تفسیر موضع القرآن بھی لکھی صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ لغات الحدیث بھی لکھی۔ تو جہاں کہیں آپ کو اس مسئلہ کو زیر بحث لانے کا موقع ملتا رہا آپ اسی طرح کا انداز اختیار کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم کتاب (الروح) کے حصّے سے متعلق پیش کیے ہیں۔ ہم یہاں لغات الحدیث سے سماعِ موثق کے متعلق آپ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مسئلہ میں آپ کا طرز استدلال کس قدر سطحی اور جانبدارانہ نیم کا ہے۔ ”سمعة کے تحت فرماتے ہیں:

”إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَكُوتِي“

”تو مردوں کو (یعنی کافروں کو) اسلام نہیں قبول کروا سکتا۔“

”اس آیت سے سماعِ موثق کی نفی نہیں نکلتی۔ جیسے حضرت عائشہؓ نے خیال کیا، کیونکہ سماع سے یہاں سماعِ اجابت مراد ہے۔ جیسے اسمع غیر مسمع میں۔ اور متعدد امامیہ سے سماعِ موثق ثابت ہے جیسے اوپر گزر چکا۔ اور اہل حدیث کے بڑے بڑے امام جیسے ابن تیمیہ اور ابن قیم اسی کے قائل ہیں۔ صرف خفیہ اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا۔ مجمع البحار میں ہے کہ ”إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَكُوتِي“ کا معنی یہ ہے کہ ”تو ان جاہلوں کو نہیں سمجھا جا سکتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بنا دیا ہے۔“

(لغات الحدیث، ردین ص ۱۶۳)

اس اقتباس پر تبصرہ کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ کیونکہ علامہ صاحب کے ان دلائل کے

متعلق ہم پہلے ہی بہت کچھ کہ چکے ہیں۔

۳۔ جب ترجمہ ہی بدل دیا تو نفیِ نکل بھی کیسے سکتی ہے؟ پھر ترجمہ بدل دینے کے بعد اسے ”سماعِ موثق“ کا ذکر ویسے ہی کھکتا ہے۔

اللہ کا حکم ہے کہ، اجماعِ مذہبی امام کا مقلد ہے اور نہ مقلد کا۔ وہ ان بزرگوں سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مگر روشنی براہِ راست کتاب و سنت سے حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

سماعِ موتی اور مولانا مودودی مرحوم

مولانا مرحوم نے سورۃ اخلاص کی آیات ۳۵-۳۶ (جو ہم آیتِ دل کے تحت مدح کر چکے ہیں) کے تحت بڑا جامع اور بصیرت افروز حاشیہ لکھا ہے جس میں قرآنی آیات کا صحیح مفہوم، اس کی صورت، صحیح احادیث کا لپٹ لپٹ سب کچھ آجاتا ہے۔ اور اکثر اشکال بھی دور ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ بیان مدح ذیل ہے :

”یعنی ان پکڑنے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں، نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انھیں کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشادِ الہی کو تفصیلاً توں سمجھتے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے ”ہوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں۔ وہ تین اقسام میں تقسیم ہیں۔ ایک بے رُوح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گنہگار ہیں۔ تیسرے مگر اہل ان جو خود بھی گمراہ ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دنیا سے نفرت ہوتے پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے مابعد کی دعاؤں سے بے خبر رہتا ظاہر ہی ہے۔ یہ دوسری قسم کے معبود، جو اللہ کے مقرب بندے تھے تو ان کے بغیر رہنے کے دعوہ جوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں، جہاں انسانی آوازیں براہِ راست ان تک نہیں پہنچتیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ اوداس کے دُشے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ سے دُعا مانگتا سکھاتے رہے تھے۔ وہ اب الٹی آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی اس دعا کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے بھی بے خبر رہنے کے دعوہ جوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملاموں کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی

مولائے رحیم ہیں بند ہیں جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اُس کے فرشتے بھی انھیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں ٹھہر گیا یا نہیں ہمدرد ہے۔ اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ یہ خبریں اُن کے لیے مسرت کا موجب ہوں گی اور خدا اُن کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دُعا سے رحمت و برکت (جیسے قبر پر یا نماز میں) پہنچا دیتا ہے کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے فرحت کا موجب ہیں۔

اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکا مار زبرد تو بیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگ بدر میں اُسے جلنے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبخ سنوا دی گئی کیونکہ اُن کے لیے یہ اذیت کا موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کا موجب یا مجرمین کے لیے فرحت کا موجب ہو، اُن تک نہیں پہنچائی جاتی۔ اس تشریح سے سماعِ موتی کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے؟

مسئلہ سماعِ موتی کی پشت پناہی | مندرجہ بالا تصریحات سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ قرآن اس مسئلے کی پُر زور تردید کرتا ہے۔ احادیث صحیحہ کو سامنے رکھ کر اگر فرقہ بین کے دلائل کا موازنہ کیا جاتے تو بھی حضرت عائشہؓ کے دلائل راجح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعد کے ادوار میں اُمت کے ایک بڑے طبقہ نے سماعِ موتی کے مسئلہ کو درست سمجھا۔ یہ طبقہ دوسری صدی میں سلیمان دزد کا طبقہ کہلاتا تھا۔ بعد میں گو وہ صوفیہ کہلانے لگا۔ اس طبقہ کا سارا کاروبار ہی سماعِ موتی کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ مزارات، چیتے کشیاں، زیارات و مکاشفات، یہ حاجت روائیاں اور تصرفات اُمید غرض جتنی اس طبقہ کے سماعِ موتی کے مسئلہ کی پشت پناہی اور حفاظت کی ضرورت ہے اور کسی مسئلہ کی نہیں۔ اگر قبر میں پڑے ہوئے بزرگ قبر پر بیٹھ کر مرقبہ کوٹے والے بزرگ کی بات ہی نہ سن سکیں یا کسی سائل کی یہ بزرگ درخواست سن ہی نہ سکیں تو آگے کام کیسے چل سکتا ہے؟ یہ طبقہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ عام مرقبے ملتے ہیں یا نہیں؟ انھیں اس معاملے سے کوئی غرض نہیں انھیں اگر غرض ہے تو صرف یہ کہ اُن کے بزرگ

مردوں کو ضرور سنا چاہیے۔

اب دیکھئے صحابہؓ میں اختلاف صرف اسی ایک سلسلہ سماعِ موتی کے مسئلہ پر ہی نہیں ہوا۔ اور بھی کئی مسائل میں ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ اس بات کے قائل نہ تھے کہ اگر پانی نہ ملے تو تہنی شخص صرف تیمم سے بھی پاک ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عمار بن یاسرؓ نے اس سلسلہ میں اپنا ذاتی واقعہ بھی پیش کیا اور کہا کہ میں خود ایک دفعہ رسول اللہؐ کے ہم سفر تھا کہ جنہی ہو گیا۔ پانی نہ ملا تو میں نے لوٹ لوٹ لگائی۔ پھر نبی اکرمؐ سے واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ صرف اتنا کر لینا بھی کافی تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے اور اپنے چہرہ مبارک اور ہاتھوں کو مسح کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا اور کسی واضح ضعف کے سبب جو ان کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت دلیل نہ ٹھہری۔

مگر دوسرے اختلافی مسائل کا یا تو بعد میں اختلاف ختم ہو گیا۔ جیسا کہ حند بن بلال جنہی کے تیمم کے درست ہونے کو بعد کے اُدار میں سب نے تسلیم کر لیا۔ یا اگر ہا تو اسی حد تک جس حد تک قویٰ صحابہؓ میں تھا۔ مثلاً جمع کی نماز کی سنتیں اگر قضا ہو جائیں تو وہ نماز کے فوراً بعد پڑھی جاسکتی ہیں۔ یا سوچ نہ گئے کے بعد بی پڑھی جائیں؛ لیکن سماعِ موتی کا مسئلہ ایسا ہے کہ جو قدر صحابہؓ میں تو معمولی قسم کا اختلافی مسئلہ تھا مگر بعد کے اُدار میں یہ سنگین اور بنیادی قسم کا مسئلہ بن گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک فرقہ کے وجود کا انحصار ہی سماعِ موتی کے اثبات پر تھا۔

پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو مردوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ مثلاً یہ بات کہ "مَرُوفٌ یُسْتَعْمَلُ" اُحادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ جب مردہ نہلا کر کھٹا پر رکھا جاتا ہے۔ تو اگر وہ نیک ہو تو قَدْ مُؤْنِی قَدْ مُؤْنِی یعنی مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو کہتا ہے۔ اور اگر بد ہے تو کہتا ہے کہ مجھے کہاں لے جا ہے ہو وغیرہ۔ لیکن کبھی آپؐ نے سنا ہے کہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؟ اگر زیر بحث آتا ہے تو وہی مسئلہ جو قبر پرستی اور شرک کی بنیاد ہے جس سے ایک طبقہ کا کاروبار بھی وابستہ ہے اور معاش بھی۔ باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی پرزور تردید فرمائی تھی، لوگوں نے اس کی راہ نکال ہی لی۔

ملہ، فقہی اختلافات کی اصلیت۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ و نشر و اشاعت، علماء اکیڈمی لاہور ص ۹۔ (طبع اول ۱۹۸۰ء)

چوتھا مرحلہ :- آخری زندگی

یہ عرصہ بعثت بعد الموت سے لے کر ابتداء تک متقدّم ہے۔ یہ دور مکمل اور مستقل زندگی ہے۔ نبی صبح کو جو جسم اس دور میں مہیا کیا جائے گا اس کی شکل و صورت وہی ہوگی جیسی اس دنیا میں تھی۔ اور وہ سب لوگ خواہ جنتی ہوں یا دوزخی ایک دوسرے کو اسی وجہ سے پہچانتے ہوں گے کہ ان کی تخلیق اور صعود میں بالکل وہی ہوں گی جو اس دنیا میں تھیں۔ البتہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اس دور میں جو جسم روح کو عطا کیا جائے گا۔ اس کا سائز اس جسم سے بہت بڑا ہوگا جو اسے دنیا میں دیا گیا تھا۔

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام بنی آدم اپنے اعمال کی بنیادوں پر گرد ہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس دور میں استثنائی صورت یہ ہے کہ دوزخی لوگ تو عذاب کی صورت میں ہر آن موت و حیات سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ جبکہ جنتی لوگوں کے لیے کسی استثنائی صورت کا ذکر نہیں۔

اس دور میں جنتی لوگ اپنے رب کے دیار سے مشرف ہوں گے۔ وہ اس دن اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھیں گے جیسے اس دنیا میں بدر کو دیکھ سکتے ہیں اور کوئی اڑ چن محسوس نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم اپنے سابقہ مضمون میں بتلا چکے ہیں کہ ان احادیث کی روشنی میں نہ کہیں تناسخ کی گنجائش تخلیق ہے نہ روح اعظم یا روح کلی کی اور نہ ہی واصل باللہ، فنا فی اللہ، واصل بحق کی یا ایسے ہی کسی کی ذات میں اللہ کے حلول کرنے کی۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے روح کے یہ چاروں مراحل بیان کرنے کے بعد فرمایا: **ثُمَّ رَأَوْا النِّیْمَہَ تَوَجَّعُونَ**۔ آیت کے یہ آخری الفاظ ایسے تمام باطل نظریات کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس **النِّیْمَہَ تَوَجَّعُونَ** کے ضابطہ راہی میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔

ارواح کی بین المراحل پیش رفت اور مراجعت

ہم روح کے چاروں مراحل کی ترتیب اور ان مراحل میں اگر کسی میں کچھ مستثیات ہیں تو ان کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک ایسے استثناء کا ذکر کریں گے جو مرحلہ ملا کو سب سے ہی حذف کر دیتا ہے۔

شہداء کی زندگی | روح کے اس تدریجی سفر میں شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان سے مرحلہ بہ مرحلہ حذف کر دیا گیا ہے۔ ان کی قبر میں سنگِ تحیر کے ذریعہ جانچ ہوتی ہے۔ اور بعض صبح و شام ان پر جنت کی طرف سے روزِ نکلتا ہے۔ بلکہ وہ شہید ہوتے ہی سیدھے مرحلہ ۱۰ میں یعنی جنت میں پہلے جاتے ہیں۔ یہ فرق البتہ ضرور رہ جائے کہ جنت میں ان کو سبز پرندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرحلہ ۱۰ میں اسداع کو اسی شکل و صورت کے اجسام مہیا کئے جائیں گے جو مرحلہ ۱۰ یعنی دنیوی زندگی میں تھے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا بھی درست ہے کہ انبیاء جو شہداء بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کے زیادہ مقدار میں کہ ان کی بھی قبر میں جانچ نہ ہو۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی جانچ ہوتی ہے ان کے معکم تو وہ خود ہوتے ہیں، لہذا ان کی جانچ کیسے؟ ان کی اسداع بھی اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں۔ انبیاء کی دوسری خصوصیات یہ ہیں (۲) ان کے اجساد میں پر حرام ہیں اور (۳) وہ غضابِ قبر کی آواز سن لیتے ہیں دوسر کوئی نہیں سن سکتا۔

روحوں کی واپسی | عام مضابطہ الہی کے مطابق روح کا پچھلے مرحلہ کی طرف واپسی کا کوئی قانون نہیں۔ جو مدخلِ سجن میں ہیں وہ تو اس لیے دنیا میں واپس نہیں آسکتے کہ وہ اللہ کی حوالات میں مقید ہیں۔ اور جو درمیں علیین یا اعلیٰ علیین (جنت) میں ہیں، وہ مجرموں کی طرح مقید تو نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنت کی نعمتیں یا بلند مقام چھوڑ کر آخر زمین کی طرف کیا لینے آئیں گے؟

اس قانون میں استثناء صرف یہ ہے کہ جب فرشتے کسی انسان کی، خواہ نیک ہو یا بد روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ روح سجن یا علیین میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس وقت اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ جب اس کے عزیز و اقارب اس کے دفن کرنے کے بعد واپس جاسکے ہوتے ہیں۔ روح کا اس وقت کوٹنا ایک اضطرابی امر ہے۔ کیونکہ جانچ ہر انسان سے کی جاتی ہے، ماسوائے شہداء اور انبیاء کے۔

اس آرائش کے بعد بھی مدخلِ سجن اور علیین میں رہتی ہیں۔ ان مدخلوں کو انہی مقامات پر رہنا ہوتا ہے اور اس کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو مرحلہ ۱۰ میں خواب میں ہوتی ہے۔ پھر کبھی کبھی اس غضاب و ثواب میں کچھ اضافہ کی خاطر روح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ روح کی یہ حیثیتاً ناجائز بدن کی طرف بازگشت بھی ایک اضطرابی امر ہے۔ اسی گاہے گاہے بازگشت کو

قرآن میں صبح و شام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اضافہ بدن کی شرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خواب میں کسی شدید واقعہ سے سونے والے کا بدن بھی متاثر ہو جاتا ہے۔
 دوسرا یہ معاملہ کہ رومیں مرید و عارفین اور سچے سچے اپنی قبروں پر شریف لائیں۔ یا ان سے مسلسل رابطہ قائم رکھیں یا اپنی قبروں پر عکس ڈالیں یا قبر کوئی انھیں اگر سلام کہے، وہ اس کے سلام کو سن کر اس کا جواب دیں۔ تو حاشا! وہ ان میں کوئی بات بھی رد و حق کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہمارے تقوٰت زدہ طبقہ نے زیر زمین ایک نئی دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ان کے نزدیک عام آدمی نہیں تو کم از کم بزرگ حضرات اپنی اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔ البتہ ان بزرگوں میں اب تعزف و فی الامور کی قدرت دنیا کے لحاظ سے کتنی گنا بڑھ گئی ہے۔ گویا اس دنیا کے جملہ اختیارات انہی قوت شدہ بزرگان کو تفویض کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بزرگ لوگوں کی فریاد سنتے بھی ہیں۔ اور اس تکلیف کو دور کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ تو قبر میں دنیا کی طرح زندہ رہنے کے اور بھی زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ دنیا بھر کے مسلمان آپ کے درخت پر جا کر سلام پڑھتے ہیں۔ اور ان کا آپ کو جواب دینا ہوتا ہے۔ اور جب تک قبر میں زندہ تسلیم دیکھے جائیں۔ وہ سلاموں کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ **إِنَّكَ مَعَهُ مَبِيتٌ** ﴿۱﴾ اور یہ حضرات جملہ ہیں کہ رسول اللہ کی ذات تو بڑی قوی و عظیم کی بات ہے۔ چارے اولیاء بھی قبروں میں زندہ موجود ہیں۔ موت ان کے لیے صرف ایک پردہ ہے۔ بس جو نبی قبر میں پہنچتے اور دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ان میں یکدم دنیوی زندگی عود کر آتی ہے۔ اور کسی عاشق رسولؐ نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ قبر میں رسول اللہ کے وہی اعمال و اشغال ہوتے ہیں جو اس دنیا میں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ قبر میں ان پر ازواج مطہرات بھی پیش کر جاتی ہیں۔ ﴿نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكُمْ﴾ (۱)

نگاہِ بازگشت | (۱) روح اللہ کی مخلوق ہے۔ حادث ہے۔ قدیم نہیں۔ اور چونکہ مخلوق ہے، لہذا کسی نہ کسی وقت فنا سے دوچار بھی ہوگی۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ: **مَنْ مِّنْكُمْ عَلَيْهِ قَاتَانِ وَ قَبِيْنِي وَ جَنَّةٌ رَبِّيْكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ** ﴿۲۷۰-۲۷۱﴾

(المؤمنین: ۲۷۰-۲۷۱)

”ہر چیز جو اس کائنات میں ہے فنا ہونے والی ہے۔ مرنے والی ہے۔ مرنے والی ہے۔ بزرگ بزرگوں کا گھر کی ذات باقی رہ جائے گی۔“

۲۔ روح پر پارہ اعلیٰ تے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں جا کر نئے بدن قدامت سے جو اکبر کار کا کام دیتا، کیونکہ یہی مرحلہ دارالامتحان ہے۔ تیسرے مرحلے میں روح کے بدن کا آخری تعین لیا جاتا ہے اور چوتھے مرحلے میں روح کو نیا بدن عطا کیا جاتے گا۔ تاکہ مرحلہ مٹ کے اعمال کا بدلہ روح اور بدن ہی کر سکیں۔

۳۔ ان چاروں مراحل میں روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اور روح ہی وہ شے سے جو عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کھیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کا دور وہ ہوتا ہے جب روح کر بدن بھی نصیب ہوتا ہے۔ بدن اگر سب سے جان بہت ہمدننا ہونے والی اور عقل و شعور یا ارادہ و اختیار سے ماری ہے۔ تاہم زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے جس مرحلے میں روح کو بدن نصیب نہ ہو وہ موت کا دور کہلاتا ہے۔

۴۔ ان چاروں مراحل میں روح چونکہ زندہ رہتی ہے۔ لہذا جہاں مراحل میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ آثار چونکہ روح و بدن کے اتصال والی زندگی کی نسبت نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ لہذا ان اور اعلیٰ مرحلے مٹ اور مرحلہ مٹ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ جن آدمیوں میں زندگی ہی غالب ہے یعنی مرحلہ مٹ اور مرحلہ مٹ، ان میں بھی موت کی استثنائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے اچلے موتی بطور خرقہ عارت اور خواب بطور عام مضابطہ الہی۔ تاہم یہ موت کے کمزور سے آثار غیر مسلسل اور غیر مستقل ہوتے ہیں۔

۶۔ بعینہ موت کے دور یعنی مرحلہ مٹ میں بھی استثنائی صورتوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ آثار حقیقی زندگی کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ جیسے عذاب قبر جو آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ اور سماع موتی کا مسئلہ بطور خرقہ عادت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کسی مردہ کی روح کو شاد دیتا ہے۔ اس میں اس مردہ کی روح کے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔

۷۔ مرحلہ مٹ میں روح کا مستقر علیٰ زمین یا ستمین ہے۔ اس مرحلے میں عذاب و ثواب قبر کا تعلق براہ راست نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ عذاب و ثواب آخرت کی نسبت ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ عذاب بواسطہ روح جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۸۔ شہداء و اوابیائے مرحلہ مٹ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی ان پر موت کے بھلے زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی دنیاوی زندگی کی طرح نہیں ہوتی۔ اس زندگی

کی کیفیت کو سمجھنا چاہئے شعور سے اور ارہے لہذا ہم ان کی اس زندگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۹۔ رسول اللہ پر صلوٰۃ و سلام، دُعا سے مہربان قبر پر، صیغہ غائب سے جو یا مخاطب سے، غائب

فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ پر سلام کہنے والے کو جواب دیں۔ یہ سلام امت کی طرف سے اجتماعی طود پر فرشتوں کے ذریعہ پہنچاتے جلتے ہیں۔ اوداسی طرح آپ اجتماعی طود پر جواب کے طور پر امت کے لئے سلام کہتے یا سلامتی کی دعا کہتے ہیں۔ کیونکہ رزق قول یہی ہے کہ آپ پر جو سلام و صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وہ سلام دعا ہے نہ کہ سلام تحیۃ۔ اسی طرح قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو جو اسلام علیکم کہا جاتا ہے۔ وہ بھی سلام دعا ہے، سلام تحیۃ نہیں۔

۱۰۔ قرآن سماع کی پر نور تردید کرتا ہے۔ صحیح احادیث استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔

ضعیف اور جمعی احادیث سماعِ موتی کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگانِ کرام کے اقوال اعدان کی خوابیں اس جواز کو تائیدِ مزید بخشی ہیں۔ اب مشکل یہ ہمیش آتی ہے کہ اگر ان بزرگانِ کرام کا احرام ملحوظ رکھ کر یہ سب درست تسلیم کر لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جعلی احادیث اور بزرگوں کی خوابیں اور اقوال واصل قرآنی آیات کا رد پیش کر رہے ہیں۔

بَلَا مَا عَنِی وَالْقَدَرُ عَلَمٌ بِالْعَصْوٰ



برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف

مسئلات
(۱)

روح۔ مقام قبر۔ سماع موتی

(یہ جوابات محدث رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوئے)

مقالہ مذکورہ کی اشاعت کے بعد مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں مختصر خط تو جناب اسحاق صاحب (مدنیہ منورہ) کا تھا۔ جنہوں نے ایک موضوع حدیث کی نشان دہی فرمائی اور جس کا ذکر پیش لفظ میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ ہم اس نشان دہی کے لیے آپ کے مشکور ہیں۔ یہ حدیث چونکہ محض تائیداً درج کی گئی تھی، لہذا اس کتاب سے خارج کر دی گئی ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر کیمپٹن مسعود عثمانی (توحید روڈ۔ کیمپری۔ کراچی) کے نظریات برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم سے کافی متاثر ہیں۔ پھر اسی مرکزی نقطہ نظر کے مطابق کچھ سوالات، کچھ اشکالات، کچھ اعتراضات پیش کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کو من و عن درج کرنا تو بہت طوالت کا باعث ہوگا، میں مختصر ان کے سوالات یا

اشکالات کو پیش کروں گا، اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا اصل مفہوم اوجھل نہ ہونے پڑے۔ پھر ان کے جوابات عرض کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔
 ان میں سے پہلے مستفسر تو جناب شاہ فاروق ہاشمی صاحب (ٹیچر گورنمنٹ پرائمری سکول قائد آباد۔ ضلع خوشاب) ہیں۔ ان کا غلط سب سے پہلے موصول ہوا اور سب سے زیادہ طویل ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کو دلائل سے پیش کیا ہے پھر میرے پیش کردہ نظریہ پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں۔
 اور دوسرے مستفسر جناب عبدالقادر سومرو صاحب (کیمیاڑی۔ کراچی) ہیں جو ہمارے پرانے کومفرما ہیں۔ انہوں نے اس نظریہ کی تائید میں مندرجہ ذیل کتابوں میں سے موضوع زیر بحث سے متعلقہ فوٹو سیٹ بھیجے ہیں۔ اور ساتھ کچھ حوالہ کی کتابوں میں سے متعلقہ راویوں پر تنقید کے فوٹو سیٹ بھی۔ ان کتابوں اور ان کے مولفین کے نام درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ ندائے حق از محمد حسین نیلوی۔
 - ۲۔ وعاہ کرنے کا اسلامی دستور از فضل الرحمن کاشمیری۔
 - ۳۔ توحید خالص قسط علیہ قبر یہ آستانے از ڈاکٹر مسعود عثمانی۔
 - ۴۔ ہفت روزہ الاسلام کے ایک مضمون ”مسئلہ سماع موتی“ سے چند اقتباسات۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومرو صاحب ایک طرف میرے پیش کردہ نظریہ سے متاثر ہیں دوسری طرف مذکورہ بالا مکتب میں پیش کردہ نظریہ سے بھی متاثر ہیں۔ لہذا وہ متذبذب ہیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں راہنمائی چاہتے ہیں۔
- سب سے پہلے ہم مستفسر کے دلائل، اس کا جواب اور ان دلائل کا جائزہ پیش کریں گے:

۱۔ قبر کا اصل مقام، اس دعوے سے متعلق کہ ”قبر سے مراد زمینی گڑھا یا حتی قبر نہیں بلکہ بزرگی قبر ہے“

مستفسر کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ قرآن میں حضرت نوح کی قوم کے متعلق آیا ہے کہ ”اَعْرِضُوا فَاَدْخِلُوا نَارًا“ اور فاتحیہ کے لیے آتی ہے۔ حالانکہ قوم لوح کو، اور اسی طرح قوم فرعون کو بھی

قبر نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ اور قرآن نے یہ کلیہ بھی بتلایا ہے کہ ”ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ“ (۳۱:۸۰) ”اور اللہ نے انسان کو موت دی پھر اسے قبر میں داخل کیا“ یعنی ان غرق ہونے والوں کو زمینی قبر تو نصیب ہی نہ ہوئی تھی لیکن عذاب مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پھر مرنے کے ساتھ ہی قبر کا ذکر بھی موجود ہے۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔ اور یہ گڑھا تو مجازی قبر ہے جو دنیا میں بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ب: حدیث میں آیا ہے:

إِنَّمَا مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى يَمُودٍ يَتَّبِعُهُ يَبْكِي عَلَيْهِمْ فَأَقَالَ: إِنَّمَا تَسْكُونُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا لَتُعَذَّبُ فِي قَابِ رِهَا“

(مشکوٰۃ باب البکا علی المیت)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ پر گزرے جس پر رو یا جابر ملتا تھا تو آپؐ نے فرمایا: ”یہ لوگ اس پر روتے ہیں جبکہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔“

اس یہودیہ کے متعلق جس کا جنازہ دیکھ کر ہی آپؐ نے فرمادیا تھا کہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ بزرخی قبر ہے۔ جہاں وہ دفن ہونے سے پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھی۔

ج: جب بعد قیامت مرد کے اپنی قبروں سے جی اٹھیں گے تو اس وقت سے پہلے ہی موجودہ زمین و آسمان تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ پھر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا کیسے لیا جاسکتا ہے؟

۲۔ کیا عذاب قبر کا تعلق جسم سے بھی ہے؟

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ عذاب قبر سے طی نہ طی حد تک جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ خواہ یہ مقدار کتنی ہی کم یا گاہے گاہے ہو، لیکن ہوتا ضرور ہے اور اس پر دلیل یہ تھی کہ جیسے نیند میں بعض اوقات رُوح کو وارداتِ رنج و راحت سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے اسی طرح عذابِ قبر سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس پر آپؐ نے دو اشکال پیش کیے ہیں:

(۱) فرعون کا جسم دنیا میں موجود ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح بھی فرمادی

”فَالْيَوْمَ نُفَجِّعُكَ بِبَدَنِكَ“ تو پھر عذاب میں جسم کی شمولیت کیونکر ہوتی؟

(ب) کافر قیامت کے دن نہیں گئے؛
”مَنْ أْبَعَلْنَا مِنْ مَّزْقِدَا“ (یس: ۵۲)

”ہمیں ہماری آرام گاہ سے جس نے اٹھا دیا؟“

اب اگر اس زمینی گڑھے کو قبر، اور جسم سے عذاب کا تعلق بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ قبر عذاب گاہ ہوئی۔ آرام گاہ کیسے ہوتی؟
یہ تو ہیں فاروق صاحب کے دلائل! — اور سومر و صاحب نے جو کتابوں

سے فوٹو سٹیٹ بھیجے ہیں، ان سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بس انداز بیان الگ الگ ہے۔ میرے خیال میں یہ حضرات دوسری انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ سب سے موتی کے قاتلین اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر میں مردہ ہر واقعہ کار کا سلام سنتا اور پھر اس کا جواب دیتا ہے یا یہ کہ ”مَنْ فِي الْقَبْرِ“ سے مراد مردہ دل لوگ ہیں۔ جبکہ ہمارے یہ کرم فرما اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر کا معنی ہی بدل دیا پھر سلام کیا، اس کا سننا اور جواب دینا کیسا؟ نہ رہے بان نہ بچے بانسری۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ تاویل و تعبیر کی ہے وہ اس لیے کی ہے کہ شرک کے اس سب سے بڑے چور دروازے کی جبر ہی کٹ جائے۔ ان کا یہ خلوص نیت درست اور مبارک، مگر ہمیں افسوس ہے کہ حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ جیلا سوچئے، اگر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہ ہو بلکہ برزخی مستقر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدر کے فوجیوں پر جا کر ان مردہ کفار کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ اپنی جگہ پر بیٹھے یا کھڑے ہی یہ خطا فرما دیتے؟ اسی طرح آپ بقیع میں جا کر کھجور دے دے یا مغفرت فرماتے تھے؟ اور آخر قبرستان میں جا کر ہی یوں آپ ”السلام علیکم یا اہل القبر“ کہتے ہیں؟
اب میں اپنے نظریہ کی تائید میں چند مزید احادیث صحیحہ پیش کروں گا:

پہلی حدیث:

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ يُعَذَّبَانِ فَقَالَ إِنَّهُمَا يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي مَكْبَرٍ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَبِرُّ مِنَ الْبُؤْلِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْنِي بِمَكْبَرِهِ ثُمَّ أَخَذَ

جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بَيْنَ صَفَيْنِ ثُمَّ عَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً
فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ لِمَ صَنَعْتَ هَذَا؟ فَقَالَ:
”لَعَلَّهُ أَنْ يَخْفَفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَمِيلَا“

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب الجرید علی القبر)
”ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں پر گڑھے
جنھیں عذاب ہو رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا، ”ان دونوں قبر والوں کو عذاب
دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی پاداش میں بھی نہیں۔ ایک تو پیشاب
سے بچاؤ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھا تا پھرتا تھا“ پھر آپؐ نے مسجد
کی ایک ہری ڈالی لی اور اس کو بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کیے اور ہر
قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے
ایسا کس لیے کیا؟“ آپؐ نے فرمایا۔ ”جب تک یہ ڈالیاں نہ سوکھیں
شائد ان کا عذاب ہلکا ہو“

اب دیکھیے اس حدیث سے مندرجہ بالا دونوں اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔

وہ یوں کہ :

۱۔ لفظ ”مَرَّتْ بِقَبْرَيْنِ“ اس بات کا متقاضی ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھے
ہیں نہ کہ برزخ میں رُوح کا مستقر۔

۲۔ آپؐ نے اسی قبر پر ہری ڈالی گاڑی جس میں جسم مدفون تھے اور فرمایا کہ شاید اس
سے عذاب ہلکا ہو۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جسم بھی عذاب سے متاثر ہوتا ہے۔

دوسری حدیث :

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ قَالَ أَخْرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ
وَجِدَتْهُ الشَّمْسُ فَسَبَّحَ صَوْتًا فَقَالَ: ”يَا مُؤَدُّ تَعَذُّبٍ فِي
قُبُورِهَا“ (بخاری، کتاب الجنائز، باب لتعود من عذاب القبر)
”ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ سے)
باہر نکلے اور اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ آپؐ نے ایک
آواز سنی تو فرمایا، ”یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے“

اگر قبر سے مراد بزرگی قبری جائے تو لفظ ”خروج“ بے کار ہے۔ مدینہ میں روکو بھی آپ یہ بات بیان فرما سکتے تھے۔ آخر آپ نے قبروں کے پاس جا کر قبروں ایسے فرمایا؛
تیسری حدیث؛

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ أَسْوَدَ رَجُلًا أَوْ امْرَأَةً كَانَ يَقِفُ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَلَمْ يَعْلَمْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: ”مَا نَعَدَ ذَلِكَ الْإِنْسَانُ؟“ قَالُوا: ”مَاتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ“ قَالَ: ”أَفَلَا أَذْنَعُ مَوْتِي؟“ فَقَالُوا: ”إِنَّكَ كَذَّابٌ وَكَذَّابَتُهُ“ قَالَ فَحَقَّرَ رِشَاءَهُ - قَالَ: فَذَلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ فَأَتَى قَبْرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ“ (بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوة علی القبر بعد ما یدفن)

”ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک کلامرد (یا کالی عورت) مسجد میں بھاڑ دیا کرتا تھا۔ وہ مر گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی۔ ایک دن آپ نے اُسے یاد فرمایا اور پوچھا کہ ”وہ کدھر ہے اسے کیا ہوا؟“ لوگوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ وہ تو مر گیا ہے“ آپ نے فرمایا ”تو پھر تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟“ لوگوں نے عرض کیا کہ ”یوں ہوا اور یوں ہوا“ عرض اس کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اسے درخور اعتناء سمجھتے ہوئے آپ کو اس کی موت کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ آپ نے فرمایا ”مجھے اس کی قبر پر لے چلو“ راوی کہتا ہے کہ پھر آپ اس کی قبر پر آئے اور اس پر نماز جنازہ پڑھی۔

یہ حدیث بھی اپنے مضمون میں صاف ہے کہ (۱) قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے ورنہ آپ اس کی قبر پر کیوں تشریف لے گئے؟ (۲) یہ کہ قبر پر آخر دعائے استغفار کرنے یا نماز جنازہ پڑھنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس قبر میں جو جسم پڑا ہے اس کا عذاب و ثواب قبر سے تعلق ضرور ہے۔

اور قرآن میں یہ الفاظ ”لَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ“ مراد زمینی گڑھا ہونے کی پوری وضاحت کر رہی ہیں مستفسر کے دلائل کا جائزہ اب ہم فاروق صاحب کے دلائل پر تبصرو۔

کرتے ہیں،

۱۔ یہ مفروضہ کہ ”یہ دنیاوی (حسی) قبر تو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے“ درست نہیں۔ جن اقوام پر خدا کا عذاب آیا اور قرآن میں مذکور ہے۔ اگر صرف ان کا تناسب نکالا جائے تو بھی یہ مفروضہ درست ثابت نہیں ہوتا۔ جبکہ بیشمار ایسی اقوام ہیں جن پر عذاب نہیں آیا۔ وہ لوگ اپنی طبعی موت مرتے رہے اور زمین میں دفن ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ابتدائے لوح انسان سے جاری ہے۔ یعنی جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا جو اس دنیا میں پہلا قتل بھی تھا اور پہلی موت بھی تو اسے اللہ کی طرف سے مردہ کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا گیا اور یہی طریقہ تمام انبیاء سکھاتے رہے۔ لہذا قاعدہ کلیہ کے طور پر یہی بات بھی جاسکتی ہے کہ انسان مرنے کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے۔ اب اگر آل فرعون یا قوم نوح غرق ہو گئے یا اہل سبا پر سیلاب آیا یا دنیا بھر میں سے ایک قوم (ہندو) اپنے مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلادیتی ہے تو یہ سب باتیں مستثنیات میں شمار ہوں گی اور آج اگر کوئی چاہے تو خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قبر میں دفن ہونے والوں کی تعداد ڈوبنے یا جلنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ لہذا عام قاعدہ کے طور پر جوابات بھی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ **ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ** ”باقی سب استثناء کی صورتیں ہیں جیسا کہ عذاب قبر بذات خود ایک استثنائی صورت ہے جس کی تفصیل میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ یہ دور قرآن کی زبان میں موت کا دور ہے نہ کہ زندگی کا۔

۲۔ آپ نے جو حدیث اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش فرمائی ہے اس کے الفاظ ہیں: **مَنْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى يَمُودٍ نَبِيٍّ** ”یعنی آپ ایک یہودی پر گزرے جس پر لوگ رو رہے تھے“ اس حدیث میں قطعاً یہ وضاحت نہیں کہ آپ اس کے جنازے یا میت پر گزرے یا اس کی قبر پر؟ اغلب گمان یہی ہے کہ آپ اس کی قبر سے گزرے تھے جیسا کہ اس مشکوٰۃ کے ترجمہ سے بھی ظاہر ہے۔ ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں،

”گزرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزدیک قبر ایک عورت یہودیہ کے کہ روایا جاتا تھا اس پر، مشکوٰۃ، باب البکاء علی المیت، مطبوعہ مکتبہ اثریہ

سانگلہ ہل ص ۱۸۲)

۳۔ تیسری دلیل یہ تھی کہ جب زمین ہی بدل جائے گی تو یہ زمینی گودھا کہاں رہے گا؟ سو گزارش ہے کہ زمین بدل ضرور جائے گی لیکن نیست و نابود یا فنا نہیں ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ ”يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ“ ہر حال اس وقت بھی کوئی نہ کوئی زمین ضرور ہوگی جو اگرچہ یہ موجودہ زمین نہ ہوگی تاہم اسی زمین کی بدلی ہوئی شکل ہوگی۔

۴۔ جسم کے عذاب سے بے تعلقی ہونے کی دلیل جو لفظ مرقد (خواب گاہ یا آرام گاہ) سے لی گئی ہے۔ یہ بھی وضاحت کے لحاظ سے سودمند نہیں۔ ان کفار کا یہ قول تو صرف انسانی فطرت کا مظہر ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ پھر اس سے بڑی مصیبت یا آفت اس پر آن پڑے تو اسے یہ چھوٹی مصیبت کا زمانہ آرام کا زمانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا جب کافر ”اشد العذاب“ کو دیکھیں گے تو انہیں یہ کم عذاب والی جگہ اس کے مقابلہ میں مرقد ہی معلوم ہوگی۔ اب خواہ یہ عذاب حسی یا مادی قبر میں ہو رہا ہو یا برزخی قبر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ رہا یہ سوال کہ فرعون کو مرنے کے وقت سے لے کر عذاب ہو رہا ہے مگر اس کا جسم بمصدق ارشاد باری تعالیٰ عذاب کے اثرات سے محفوظ و مامون ہے۔ تو یہ محض ایک استثنائی صورت ہے، جس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ، کبھی بھی انسان کا جسم خواہ وہ نیک ہو یا بد عذاب و ثواب قبر سے کلمۃ اور کبھی بھی متاثر نہیں ہوتا، درست نہ ہوگا۔ اوپر درج شدہ احادیث ہمارے اس خیال کی تائید میں پوری رہنمائی کرتی ہیں۔

۳۔ رد و حول کی ملاقات،

اس سوال میں آپ نے کئی اشکالات کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً،
(۱) خواب میں جب روح کلبن سے علیحدگی ہو گئی تو اسی الفکاک روح ہی کا نام تو موت ہے۔ پھر اگر جسم کو بھی عذاب و ثواب میں شریک سمجھ لیا جائے تو یہ زندگی ہوئی موت تو نہ ہوئی؟

(۲) خواب میں کسی شخص کی روح جب کسی مرے ہوئے ظالم انسان کی روح سے،

جو جہنم میں مقید ہے، ملتی ہے تو کیا اس سونے والے شخص کی رُوح وہاں پہنچ جاتی ہے یا اس ظالم اور ڈاکو انسان کی رُوح وہاں سے آزاد ہو کر اسے خواب میں آکر ڈراتی دھمکاتی ہے؟ وہ ضابطہ الہی کو توڑ کر اس دنیا میں کیسے آجاتی ہے؟

۳۔ ایک ہی خواب میں ایک رُوح کئی آدمیوں کو خواب میں ملتی ہے تو کیا ایک ہی رُوح سب کو ملتی ہے یا علیحدہ کوئی رُوح؟

ان سوالوں کا جواب دینے کی بجائے میں فاروق صاحب کو یہ مشورہ دوں گا کہ میرے مضمون کا متعلقہ حصہ دوبارہ غور سے پڑھ لیں، خصوصاً ص ۲۴ کا یہ پیرا کہ: ”یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان تجربات و مشاہدات کی وجہ یا اسباب و غلّ تلاش کرنا شروع کر دے تو وہ اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ أَلَعِلْمٍ إِلَّا قَلِيلًا“

لہذا میرا غرضانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ایسی باتوں کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں جن کا سمجھنا انسان کی عقل سے ماوراء ہے۔ نہ ہم ان باتوں کے سمجھنے کے مکلف ہیں اور نہ ایسی باتیں اعتقادات میں کوئی مقام رکھتی ہیں۔

۴۔ جدث اور قبر،

جدث اور قبر کا فرق میں نے یہ بیان کیا تھا کہ قبر وہ ہے جس کے نشانات موجود ہوں اور جدث وہ ہے جس کا سرے سے کوئی نشان ہی نہ تھا یا نہ ہو۔ اس پر آپ نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قیامت کے دن مردوں کے قبروں سے جی اٹھنے کے متعلق قرآن نے جیسے جدث کا لفظ استعمال فرمایا دیکھیں ہی قبر کا بھی فرمایا ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ زمین ہی بدل چکی ہوگی تو پھر ان میں فرق کیا ہوا؟

چنانچہ جہاں میں نے یہ فرق بتلایا تھا، وہاں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ میرا اپنا فہم ہے اور مجھے اپنے فہم کو دوسروں سے تسلیم کروانے پر قطعاً کوئی اصرار نہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس پر اہل لغت کا اتفاق بھی ہے کہ دو مترادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق ہوتا ضرور ہے۔ ورنہ ایک کے بعد دوسرے لفظ کے وجود میں آنے کی کوئی

وجہ نہیں۔ اب میرے اس فہم کی مزید وضاحت یوں سمجھئے کہ قبر کا لفظ عام ہے اور جدت خاص ہے۔ ہر جدت قبر ضرور ہوتی ہے مگر ہر قبر جدت نہیں ہوتی۔ امید ہے اب آپ یہ فرق اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

۵۔ سماع موتی ۱

اس مسئلہ میں فاروق صاحب کا رویہ شدید اور انتہا پسندانہ ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی رو سے سماع موتی ثابت نہیں ہوتا تو پھر سماع موتی کا قائل مومن ہے یا کافر؟ نیز یہ کہ قلیب بدر کے واقعہ کے فہم میں جب حضرت عائشہؓ کا مقام بلند تر ہے تو پھر جو شخص بلند تر سے کم تر کی طرف رجوع کرے اس کے متعلق آپ کا فتویٰ کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میں کوئی فتوے دینے کے حق میں نہیں، البتہ یہ مشہور ہے کہ جہاں کہ آپ اتنے تشدد نہ ہوں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سماع موتی کے قائل تھے تو اس کا حوالہ کیا ہے؟ سو اس کے حوالہ کے لیے دیکھیے ”جمع العوائد“ ج ۲، ص ۶۷۹ طبع ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء مطبوعہ مدینہ منورہ۔ الفاظ یہ ہیں:

”رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقِفُ عَلَى قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبَى بَكْرًا وَعُمَرَ وَرَوَاهُ مَا لِكَ“

نیز حواہ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۵۰۵، الفاظ یہ ہیں:

”قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: ”مَا نَعْلَمُ أَحَدًا عَنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَّ ذَلِكَ إِلَّا ابْنُ عُمَرَ“ (رواہ عبد الرزاق)

یعنی تمام صحابہؓ میں سے صرف عبداللہ بن عمرؓ ہی رسول اللہ کی قبر پر دُرود پڑھتے تھے۔ دوسرا کوئی صحابی یہ کام نہ کرتا تھا۔

دوسرے مستفسر جناب سومر و صاحب نے مندرجہ ذیل تین امور کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱۔ قبر کا معنی اور مقام؛

اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر پیش کر چکا ہوں اور دلائل کا جائزہ بھی ان کے

اس سوال کے لیے بھی وہی جواب کافی ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

۲۔ نقدِ احادیث:

اس سلسلہ میں آپ نے دو احادیث پر تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) سیاح فرشتوں والی حدیث (جو نسائی میں مذکور ہے) کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی "نراذان" ہے جو مجروح ہے اور شیعہ بھی ہے، لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔

(۲) "رَدَّ اللہُ عَلٰی رَمُوحِی" (ابوداؤد بیہقی) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں دوراوی ابو صخر حمید بن زیاد اور یزید بن عبد اللہ بن قسیط مجروح ہیں، لہذا یہ حدیث بھی مجروح یا موضوع ہوئی۔

پھر انہی باتوں کی تحقیق کے لیے آپ نے مختلف محبِ رجال سے فوٹو سٹیٹ بھی بھیجے ہیں اور مذکورہ بالا کتابوں کے فوٹو سٹیٹ بھی۔ تاکہ ان مصنفین کے تبصرہ کا بھی علم ہو سکے۔

حدیث پر تنقید کرنا ایک مستقل فن ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد تمام رواۃ کے حالات زندگی اور ان کے باہمی روابط سے واقف ہونے کے علاوہ اصولِ حدیث سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہو اور یہ کام ہر محسوس و نا محسوس کے بس کا روگ نہیں۔ محال کی کتابوں کے تبصرہ پر انحصار کر کے کسی حدیث پر تنقید کر دینا بھی غیر محتاط روش ہے نیز کہ بسا اوقات کسی ایک راوی سے متعلق تبصروں میں اختلاف ہوتا ہے، جیسا کہ خود جناب محمد حسین صاحب نیلوی نے اپنی کتاب "ندائے حق" کے ص ۱۹۵ پر خود اس بات کا اعتراف کیا ہے، وہ ابو صخر بن زیاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اسے واقعی کئی اصحابِ جرح و تعدیل نے ثقہ لکھا ہے مگر بعض دوسرے محققین نے اس کی تضعیف بھی کی ہے۔"

اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک محدث کسی راوی کو ضعیف قرار دینے کے باوجود اس سے حدیث روایت کر جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہی حدیث بعض دوسرے طریقوں سے مذکور ہوتی ہے جس کے تمام تر رواۃ ثقہ ہوتے ہیں۔ لہذا اندرین صورت حال محدث اس ضعیف راوی کی روایت

کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ اسی بنا پر نیلوی صاحب کو اپنی کتاب ”ندانے حق“ کے ص ۱۹۵ پر یہ فقرہ بھی لکھا پڑا کہ کسی راوی کے متعلق ”صرف اتنا کہہ دینا کہ صحیح مسلم کا راوی ہے لہذا قوی ہے بنی برہمیل ہے“ (یہ فقرہ یزید بن عبدالمعز بن قسبط پر تبصرہ کے ضمن میں آپ نے لکھا ہے) پھر اس صورت حال میں کسی مسئلہ کے مخالف و موافق دونوں، کھینچ تان کر کے اپنا اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہذا مسلک اعتدال یہی ہے کہ انسان بغیر جانبدار ہو کر ان کتب کی طرف رجوع کرے اور اس سے زیادہ محتاط مسلک یہ ہے کہ کسی محدث کے تبصرہ پر قناعت کرے۔

لہذا ہم ان دونوں احادیث کو موضوع بحث کے حق میں نہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ضعیف روایات ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور ضعیف روایت تائید کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ البتہ جب ایسی حدیث اپنے مضمون میں منفرد ہو تو اس سے احتیاج درست نہیں؛ بالخصوص اعتقادات میں!

اور یہ تبصرہ بھی ہم نے ان مصنفین حضرات کی تحقیق کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے درنہ بہت سے محدثین سیاح فرشتوں والی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۷۹ حدیث ۹۵۷۵ (مطبوعہ مدینہ منورہ طبع ۱۳۸۱ھ) الفاظ یہ ہیں:

(۱) ”نَدَاهُ اَيْضًا اَحْمَدُ وَابْنُ جَبَّانٍ وَالتَّحَاكُمُ وَصَحَّحَهُ،
وَاقَرَّهُ الدَّهْمِيُّ وَقَالَ التَّنِيَّيْ رَجَالُ رَجَالٍ الصَّحِيحُ وَ
قَالَ الْعِرَاقِيُّ الْحَدِيثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ دُونَ قَوْلِهِ سَيِّئَاتٍ
كَذَا فِي الْفَيْضِ“

”اس حدیث کو احمد، ابن جبان اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا، اور ذہبی نے اس روایت کو پائیدار سمجھا اور بیہوشی نے کہا کہ اس کے تمام راوی صحیح ہیں اور عراقی نے کہا کہ یہ روایت ”سیئاتین“ کے لفظ کے علاوہ متفق علیہ ہے۔ ایسا ہی فیض القدیر شرح جامع التفسیر میں بھی لکھا ہے“

(۲) ”رَدَّ اللَّهُ عَلَى رُوَيْحِي“ والی روایت کو بیہوشی نے ضعیف قرار دیا ہے۔“

(جامع الصغیر ج ۲ ص ۱۴۸) تاہم موجودہ دور کے محدث البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ گو یہ حدیث صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ تاہم حسن ہے ضعیف نہیں۔ ان تبصروں کے بعد اس تیسرے طبقہ کے حضرات کے تبصروں کو سامنے لائیے، تو خود بخود یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلے انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہیں۔ پھر ایسی احادیث کو مجروح یا موضوع ثابت کرنے کے لیے اعتدال کی راہ سے ہٹ کر کھینچنا ان سے کام لیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ:

”قرآن سراج موفیٰ کی پر زور تردید کرتا ہے، احادیث صحیحہ استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی روایات اس کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگوں کے اقوال اور فرامین قرآن کا رد پیش کرتے ہیں۔“

۲۔ تاویل حدیث:

سومر و صاحب لکھتے ہیں کہ:

”احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ”مردہ کو جب کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو۔۔۔۔۔“ اس حدیث سے بھی تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حدیث کا بعینہ وہی مطلب نہیں ہوتا جو اس کے ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس اشکال والی حدیث کا، کسی دوسری اشکال والی حدیث کو ملحوظ رکھ کر مطلب سمجھا جائے گا۔“

پھر مثال کے طور پر جو دوسری اشکال والی حدیث آپ نے درج فرمائی وہ یہ ہے کہ:

”بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تا آنکہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“

یہ حدیث درج کرنے کے بعد سومر و صاحب لکھتے ہیں کہ ”اگر کوئی وحد الوجودی یا حلولی یہ کہہ دے کہ خدا تو خود بہت ہے کہ میں اس کے اعضاء بن جاتا ہوں تو یہ اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ اس کے یہ معنی نہیں، یہ تو انداز بیان ہے؛“

غور فرمائیے کہ اگر کسی ایسے صوفی کو یہ کہا جائے کہ یہ تو محض انداز بیان ہے تو کیا وہ آپ کے اس جواب سے مطمئن ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، صرف انداز بیان کہنے سے وہ فحشی مطمئن نہیں ہوگا، بلکہ اس کے اطمینان کے لیے اسے حدیث کا مطلب سمجھانا پڑے گا اور اسی حدیث کے مطلب میں نظریہ حلول کا پورا رد موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ حلولی یا وحدت الوجودی عباد اور معبود ہونے کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا ایک حصہ اور اس کا ہر تصور کرتا ہے جبکہ یہ حدیث شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ ”جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے۔“ گویا عباد اور معبود کا تصور ہی اس حدیث کی بنیاد ہے۔ رہا اس کے اعضاء کا اللہ کے اعضاء بن جانے کا مسئلہ، تو اس کو جب پہلے حصہ سے متعلق کیا جائیگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس بندہ کے اعضاء سے منشاء الہی کے خلاف کوئی کام صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو کچھ خدا چاہتا ہے وہی کچھ اس کے اعضاء کرنے لگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس بندے کے اعضاء پر منشاء و منشاء الہی اتنی محیط ہو جاتی ہے کہ منشاء الہی کی تعین کے لیے اس کے اعضاء آلہ کار کا کام دینے لگتے ہیں اور یہی عبودیت کا بلند مقام ہے جو حلولی اور وحدت الوجودی نظریاتی عین ضد ہے۔ حلولی نظریہ میں عبادت محض اور تقرب الی اللہ کیسی؟ پھر اس حدیث کے لگے الفاظ یوں ہیں:

”وَأَنْ سَأَلْنِي لَا مَعْطِيكَ وَلَا لِيِنْ اسْتَعَاذَنِي لَا عُيْدَنِي“

(بخاری کتاب الزقاق)

”اور اگر وہ (میرا مترب بندہ) مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے

دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں پناہ دیتا ہوں۔“

گویا اس حدیث کا پہلا حصہ بھی عباد اور معبود کے تعلق کو واضح کر رہا ہے اور آخری حصہ بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے تو پھر ہمیں اس حلولی کو محض انداز بیان کہہ کر مطمئن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں تو اس حدیث سے اس کا پورا پورا رد کرنا

چاہیے اور یہ بھی بتلادینا چاہیے کہ اس سیاق و سباق کے درمیان والی عبارت کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے نہ وہ جو تم سمجھ رہے ہو۔ پس یہ محض انداز بیان نہیں ! اس حدیث کے درج کرنے سے غالباً آپ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جیسے اس اعضا والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے، اسی طرح اس مردے کے کلام کرنے والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے۔ اور وہ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو مردہ کے ہونٹ ہلتے دیکھتے ہیں، نہ ہی اس کی تلواریں ہٹتے ہیں۔ مگر ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردہ بولتا ہے۔ اسی طرح عذاب قبر کے سلسلہ میں جو قبر کا ظاہری لفظ ہے۔ اس سے مراد زمینی گڑھا لینا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں ہمیں اس مردہ کے بولنے والی حدیث میں بھی کسی دم کی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ہم اس کا کلام سن یا سمجھ نہیں سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ :
 ”وَلَنْ يَمُنَ شَيْءٌ إِلَّا بِسَمْعٍ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَعْقِلُونَ تَسْبِيحَ حَمْدِهِ“ (سنن ترمذی)
 ”کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ حمد بیان کرتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔“
 تو جب ہم اتنی غیر التعداد اشیا کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، اور ہمارے اس نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ تو ان کی تسبیح میں کوئی فرق آتا ہے نہ ہمیں اس کی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر اگر ہم ایک مردے کی بات سن یا سمجھ نہ سکیں تو آخر اس مفکر کی صورت اختیار کرتے ہوئے تاویل کی راہ کیوں سوچیں؟ اور قبر کا معاملہ تو اس سے بھی خاص ہے۔
 قبر ایک مادی اور حسی چیز ہے۔ قبر کا لفظ بولنے سے فوراً ہر کوئی سمجھ جاتا ہے، اور ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے، تو پھر آخر اس قبر کو زمینی قبر ہی سمجھ لینے سے کیا چیز مانے؟
 ماحصل استفسار کے سوالات و اشکالات کا جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے نظریہ کی ایک بار پھر وضاحت کر دوں جو اس طرح ہے :

- ۱۔ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہی گچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اٹھایا۔
- ۲۔ قبر کی نئی تعبیر کہ اس سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برزخی قبر ہے، مابعد کی پیداوار ہے جو تقریباً یا دوسری انتہا ہے اور یہ غالباً شرک کے اس جہد دروازہ کو بند کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔
- ۳۔ مرنے کے بعد روح کو نیا جسم عطا نہیں ہوتا بلکہ مروج کا اپنا بھی جسم اللہ شکل ہوتی ہے اور یہ اس دنیوی زندگی میں بھی ہے۔ خواب میں بھی شکل و صورت ہوتی ہے اور یہ شکل و صورت

مرحلہ میں بھی تھی۔ اور اس کی شکل و صورت انسان کے ظاہری جسم کی شکل و صورت جیسی ہی ہوتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے زیتون کے درخت میں زیتون کا تیل یا کوئلہ میں جلنے والی گئیں یا آگ۔

۴۔ مرنے کے فوراً بعد ہی رُوح کو عذاب و ثواب سے دوچار ہونا پڑتا ہے خواہ ابھی مُردہ دفن نہ ہوا ہو اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

۵۔ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردہ کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکا ہے۔ اس وقت اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جو توفیق کی چاب بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطرابی امور ہیں۔ ان میں استثنائے یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرع نصیب ہی نہ ہوا ان پر یہ واردات صرف رُوح پر ہی واقع ہوتے ہیں۔

۶۔ کبھی کبھار اس رُوح کے عذاب و ثواب کا خفیہ سا اثر اس جسم بھی پہنچ جاتا ہے جو قبر میں دفن ہوتا ہے (اگر ہو تو) جیسا کہ خواب میں انسان کی رُوح کو رنج و راحت سے متاثر ہوتی ہی ہے، لیکن کبھی کبھار اس کا اثر انسان کے بستر پر پڑے ہوئے جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۷۔ جس طرح سونے والے شخص کے خواب میں دنیا اور جہان اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتے ہیں اور وہ جاننے والوں کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے اسی طرح مرنے ہوئے انسان کی بھی دنیا جہان اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتی ہے اور وہ ان کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے لہذا قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ مُردے جو قبروں میں مدفون ہیں اور اسی طرح ان کی روحیں بھی، ہم دنیا والوں کی آواز یا فریاد قطعاً سن نہیں سکتے اور اس میں استثناء یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو کسی کو سنا بھی سکتا ہے۔

۸۔ ایسے سوالات یا اشکالات، کہ خواب میں ایک انسان کی رُوح کسی مرنے ہوئے کی رُوح یا زندہ کی رُوح سے کیسے ملتی ہے؟ ان کا حل تلاش کرنا انسانی عقل سے ماوراء ہے۔ ان کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، نہ ہی ایسی باتوں کا عقائد سے کچھ تعلق ہے۔

۹۔ رسول اللہ پر جہاں انہیں سے بھی درود پڑھا جائے وہ فرشتوں کے ذریعہ ان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

۱۰۔ عالم بزرگ فی الحقیقت موت کا عالم ہے کیونکہ اس میں رُوح اور جسم کا انحصال ہوتا ہے لیکن اس میں بھی استثنائی صورت موجود ہے تاہم اس میں موت کے اثرات ہی غالب سمجھتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں، جو کہ عالم حیات ہے، استثنائی صورت خواب ہے اور اس خواب میں حیات کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم علماً اتم و سکرہ حکم

ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ

مراسلات

(۲)

متعلقہ

روح، مقامِ قبر اور سماع موتی

(یہ جوابات محدث کی دوا قساط ربیع الاول اور ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)
محدث جون ۱۹۸۴ء میں "مراسلات" کے عنوان سے میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس سے متعلق دو حضرات کا طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں ایک تو وہی پرانے کو مفرما جناب سومر و صاحب ہیں اور دوسرے اشفاق صاحب ناظم آباد کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب سومر و صاحب نے کیپٹن مسعود الدین عثمانی صاحب کا پورا لٹریچر بھی مجھے مطالعہ کے لیے بھیج دیا ہے اور استدعا کی ہے کہ میں اس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے آگاہ کروں۔ عثمانی صاحب کا لٹریچر تو میں پہلے بھی سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ اب نظر ثانی کا موقع مل گیا۔ جبکہ اشفاق صاحب کا خط خاصا طویل ہے۔ اسے خط کے بجائے عتاب نامہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ حضرت عثمانی صاحب کے نہایت شدید انتقادی اور ان کے مخصوص نظریات میں عثمانی صاحب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں۔ خط کا لب و لہجہ نہایت تند و تیز ہے۔ ہر وہ محدث، امام یا عالم حدیث جو انھیں اپنے مخصوص نظریات کے خلاف نظر آیا، کھلے دل سے اور ٹھوک کے حساب سے انہیں بدعقیدہ، گمراہ اور کافر و مشرک قرار دے دیا ہے۔

علمی مسائل کی تحقیق میں یہ انداز قطعاً غیر مناسب ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف

ہو جانا ایک فطری امر ہے، لیکن جب اس میں اس قسم کا تشدد و تعصب پیدا ہو جائے تو یہ چیز امت میں اختلاف اور فترتہ بازی کی بنیاد بن جاتی ہے جسے قرآن نے شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ اشفاق صاحب کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جس جرم کی پاداش میں وہ دوسروں کو کافر و مشرک قرار دے رہے ہیں، خود ہمیں اس سے بڑے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ہیں؟ بالخصوص اس صورت میں جبکہ رسول اللہ کا یہ واضح ارشاد موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے، تو اگر وہ کافر نہیں تو گھنے والا ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ لہذا تحفیر بازی سے حتی الوسع پرہیز لازم ہے۔

اب قرآن کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کا بھلا ہوا شرک۔ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنا اور عیسائیوں کا تین خداؤں کا عقیدہ رکھنا۔ بیان کرنے کے باوجود انہیں مشرک نہیں کہا بلکہ اکثر مقامات پر اہل کتاب ہی کہا ہے۔ لہذا میں اشفاق صاحب کی بجائے عثمانی صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے قریبن کو ہدایت کریں کہ علمی مسائل کی تحقیق میں فرو تر باتوں پر اتر آنے کے بجائے علمی انداز ہی اختیار کیا کریں۔

اشفاق صاحب کے اس طویل خط میں تمام کے تمام اقتباسات عثمانی صاحب کے لٹریچر ہی سے دیے گئے ہیں۔ لہذا ہم اس خط کو بعینہ چھاپ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف قارئین کو عثمانی صاحب کے لٹریچر کا خلاصہ معلوم ہو جائے گا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرات ان نظریات کے مخالفین کے لیے محسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ خط بجنسہ درج ذیل ہے:

اشفاق صاحب کا عثمانی نامہ:

مکرمی و محترمی مولانا عبدالرحمن حیدرانی صاحب السلام علیکم۔
 محدث جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں مراسلات کے عنوان سے آپ نے رُوح، عذاب قبر اور سماج موتی سے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس میں چند باتیں میرے فہم سے بالاتر ہیں۔ (مید ہے کہ آپ اگلی اشاعت میں میرے ان اشکالات کا واضح جواب شائع فرمائیں گے۔ مشکور ہوں گا۔)
 دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد ہی کو لیا ہے جو صحیح

نہیں۔ دراصل ہر مرنے والے کو قرآن کے فرمان کے مطابق (تَحْتَ أَمَاتٍ فَأَقْبَرُ) قبر ملتی ہے۔ چاہے اس کو پھیلیاں ہی ہرپ کر گئی ہوں۔ یہی اصل قبر ہے جہاں روح کو دوسرے برزخی جسم میں ڈال کر قیامت تک رکھا جائے گا۔ اور اس پر راحت یا عذاب کا پورا زمانہ گزرے گا۔

بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵ میں یہ روایت موجود ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ میں نے عمرو ابن ابی العزائمی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنٹوں کو پھینچ رہا تھا۔ اسی طرح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵ میں سمرہ بن جندب کی طویل روایت موجود ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ رُوحوں کو جسم برزخی ملتا ہے اور رُوح اور اس برزخی جسم کے مجموعے پر راحت و عذاب ہوتا رہے گا۔ یہ عذاب کا سلسلہ تا قیامت چلے گا۔ یہ برزخی جسم ایسا ہے کہ اگر اس کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ پھر بن جاتا ہے۔ دنیا میں زنا کاروں کی قبریں مختلف ملکوں میں ہوتی ہیں مگر برزخ میں ان کو ایک ہی نور میں برہنہ حالت میں جمع کر کے آگ کا عذاب دیا جاتا ہے، اسی طرح بخاری جلد ۱ ص ۸۴ پر برابر بن عازب سے روایت موجود ہے کہ جب ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تو رسولؐ نے فرمایا: کہ اُن کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے۔ اسی طرح شہدار کے لیے مکہ جلد ۲ ص ۱۳۵ میں روایت عبد اللہ بن مسعودؓ سے آئی ہے کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ شہداء کی رُوحیں سبزاڑنے والے قابلوں میں ہیں۔ اور اُن کے لیے قندیلیں عرش الہی سے لٹکی ہوتی ہیں۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء، عام مومن، کافر، مشرک سب ہی کو ایک برزخی جسم ملا ہے اور وہی اُس کے لیے برزخی قبر ہے عذاب اور ثواب کا سارا معاملہ اسی برزخی جسم کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ گڑھا جس کو غلطی سے آپؐ نے بھی قبر کا نام دے دیا ہے اور نہ اس غصّری جسم کو عذاب اور ثواب سے کوئی تعلق۔

آپؐ نے اس گڑھے کو قبر ثابت کرنے کے لیے جو چند احادیث تحریر فرمائی ہیں ان کا جواب یہ ہے:

قبروں پر ٹہنیاں لگانے سے متعلق بخاری کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس کا منہم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور

تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی لیے آپؐ نے شاخیں لگا کر برزخی عذاب سمجھا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مُردے دفن کیے گئے تھے ان پر برزخ میں یہ حالات گزر رہے ہیں۔ یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اس حدیث کی آپؐ نے سن مانی تشریح کر کے یہ بات نکال لی کہ انہی دنیاوی قبروں میں دنیاوی جسموں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ بڑی گستاخی ہے اور نبیؐ پر کتاب اللہ کے جھٹلانے کا غلط الزام ہے۔

نبیؐ کو کتاب اللہ کی تشریح اور تائید کے لیے بھیجا گیا تھا جھٹلانے کے لیے تو نہیں۔

اسی طرح بعض لوگ مسلم کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس میں قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے نبیؐ کا پتھر بدکا۔ اور اس سے یہ دلیل نکالی جاتی ہے کہ مشرکوں پر ان ہی دنیاوی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے جس کی صحیح و پکار کو سن کر پتھر بدکا۔ خدا را سوچئے، کتنے پتھر، گھوڑے، گدھے آج بھی قبرستانوں میں گھومتے رہتے ہیں ایک بھی نہیں بدکا۔ دراصل یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اور اس خاص واقعہ کے ذریعے نبیؐ نے کفار پر برزخی عذاب، جو ان کو برزخی قبر اور برزخی جسم میں دیا جا رہا تھا، صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں محفوظ فرما دیا۔ مسلم کی ایک روایت جو جلد ۱ ص ۳۹ پر موجود ہے جس میں نبیؐ نے قبر پر نماز ادا فرمائی۔ بخاری کے حوالے سے آپؐ نے جس کو ان ہی دنیاوی قبروں کے لیے دلیل بنایا۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ قبریں اپنے اہل پراندھیروں سے بھری رہتی ہیں۔ میری دُعا سے اللہ تعالیٰ انہیں منور کر دیتا ہے۔ اگر اس روایت سے جیسا کہ آپؐ نے سمجھا ہے اور دُوسروں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے دنیاوی قبر مراد لی جائے تو ایک ایک قبر میں بے حساب مُردے دفن ہوتے ہیں۔ کوئی اچھا کوئی بُرا ہر ایک کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا۔ اس کے بجائے اصل سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس گڑھے کو قبر اور اس میں سوال جواب کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے

مسلم کے حوالے سے عمرو بن عاصؓ کی مرتے وقت وصیت پیش کی جاتی ہے۔ اقول تو مسلم کی اس روایت پر امام نوویؒ نے جرح کی ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن میں کلام کیا گیا ہے۔ دیکھیے شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۷۶۔ مزید یہ کہ اس کے راوی ابو ماسم ضحا کہ ابن مخلد کو عقلی کتاب الضعفاء میں لائے ہیں۔ دیکھیے الضعفاء للعقلی ص ۱۷۱۔ میزان اعتدال جلد ۲ ص ۳۲۵

دوسرے یہ کہ یہ سکرات الموت کی بات ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ”وہو فی سباق الموت“ ایسے وقت کی بات ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہ ہو۔ قرآن اور حدیث کو کسے بھٹلایا جاسکتا ہے۔ آخر لوگ واقعہ قرطاس کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ پر مرض کی شدت کی وجہ سے بحرانی کیفیت طاری ہے۔ اسی کے زیر اثر آپ یہ فرما رہے ہیں، اس لیے لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ذیل میں لوگ بریدہ اسلمیؓ کی وصیت پیش کرتے ہیں جو بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱ پر موجود ہے۔ یہ بھی ان کی وصیت ہے جس کا کیا اعتبار؟ جسے آپ نے ماحصل کے ذیل ص ۵ صفحہ ۲۱۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردے کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکتا ہے۔ اس وقت اس سے سوال اور جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جہتوں کی چاب بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطرابی امور ہیں۔ ان میں استثناء یہ ہے کہ جن لوگوں کو قبر نصیب نہ ہو ان پر یہ واردات صرف رُوح پر ہی واقع ہوتے ہیں، ”گویا کہ آپ بھی رُوح والی روایتوں کے قابل معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ روایتیں سنداً ضعیف اور نص قرآنی کا انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءِ آپ کے عقیدے کے مطابق مُردہ کے دفن ہوتے ہی رُوح واپس آ جاتی ہے۔ گویا مُردہ مُردہ نہ رہا۔ قبر میں پھر زندہ ہو گیا جو قرآن کے خلاف ہے۔ پھر یہ رُوح آخر دوبارہ واپس گئی بھی یا نہیں؟ اگر آسمانوں میں اوپر واپس چلی گئی تو اس کے لیے آپ کے پاس حدیث کی کوئی دلیل ہے؟ دراصل یہ فتنہ نیا فتنہ نہیں بلکہ اس کے بانی مہابی احمد بن حنبل ہیں جو رُوح کے قابل ہیں۔ جیسا کہ کتاب اسلوۃ

۳۵ طبع قاہرہ میں تحریر ہے :

”پھر ارواح کے قبروں میں جموں کے طرف لوٹائے جانے پر ایمان لانا
مزدوری ہے“

ان الفاظ کو پڑھیے اور احمد بن حنبل کی بدعتیہ کی پر سر دھنیے۔ اب بتائیے
کون شخص احمد بن حنبل کو مسلمان سمجھ سکتا ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ہی اس
بدعتیہ کی کو معاشرہ میں رائج کیا اور امت مسلمہ آج تک جس کی سزا بھگت رہی
ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مرنے کے بعد صرف قیامت کے
دن ہی انسان زندہ ہوگا۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
تُبْعَثُونَ۔ سورة المومنون ۱۵، ۱۶ اسی طرح سورة البقرة ۲۸
كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أََمْوَانًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ لُمِيْتُمْ كُمْ
ثُمَّ يُخَيِّدُكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

اسی طرح سورة التومن ۲۲ میں ہے۔ قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اَلْأَنبِيَاءَ
وَاحْصَيْنَا اَلْأَمَلِيْنَ فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ
مِّنْ سَبِيلٍ۔

محترم سوچیے دو زندگیوں اور دو موتوں کے بعد تیسری زندگی اور تیسری موت
کہاں سے آئی؟ آپ نے تو قبر میں روح پٹا کر ایک تیسری زندگی کا جواز نکال دیا۔ جو
کھلا قرآن کا انکار ہے۔

اس تضاد کو دور کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر روح کو ایک
برزخی جسم ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام
احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔
مکہ کی آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جانے والے آدمیوں کے جو توں کی چاپ
بھی سنتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ دراصل یہ چاپ آدمیوں کی نہیں بلکہ فرشتوں کی ہوتی
ہے جیسا کہ بخاری کے شارح ابن المنیر کی شرح ہے جس کو ابن حجر عسقلانی فتح الباری
میں لائے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے :

ابن حجر مستطانی نے کہا کہ بخاری کے اس باب باندھنے کے (المیت یسمع قعر النعال - یعنی مردہ جوتوں کی چاپ سنتا ہے) کے متعلق الزین بن النیر نے کہا کہ مصلحت (بخاری) کے اس مضمون کے باب باندھنے سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اس طریقہ کو آداب دفن میں اولیت حاصل ہے۔ کہ وقار برقرار رکھا جائے۔ شور و شر سے اجتناب کیا جائے۔ اور شدت کے ساتھ پیروں کو نہ مارا جائے۔ جیسے کہ ایک زندہ سونے والے کے لیے ہونا چاہیے اور ایسا لگتا ہے کہ بخاری نے (نبی کے الفاظ سے) یہ نکالا ہے کہ آدمیوں سے جیسا کچھ سنا جاتا ہے ویسا ہی فرشتوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ (یعنی اُن کے جوتوں کی آواز)

شاید آپ کا دوسروں کی طرح یہ عقیدہ بھی ہے کہ رُوحیں علیتین اور سبتین میں رہتی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ علیتین اور سبتین رُوحوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ نیکوں کا رول اور بدکاروں کے اعمال ناموں کے دفتر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَمَا أَذْرَاكَ مَا يَسْجُدُونَ كِتَابَ مَرْقُومٍ وَفِيلٌ يُؤْمِنُ لِلْمُكْدِنِينَ۔ سورة المطففين (ایت ۹۷، ۹۸)، اور كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَنْبِيَاءِ لَفِي عِلِّيِّينَ وَمَا أَذْرَاكَ مَا عَلَيُّونَ كِتَابَ مَرْقُومٍ يَشْرَبُهُ الْمُقَرَّبُونَ۔ صرف یہی نہیں بلکہ کُفْرانہ لوگ سورۃ اعراف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ ”ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات جھٹلاتے ہیں اور ان سے استکبار کرتے ہیں آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے“ جو اب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن کی ادیبانہ زبان ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کی دعائیں اور خود ان کی ہرگز پذیرائی نہ ہوگی۔ ایک دلیل کلام المیت علی الجنائزہ کی بھی پیش کی جاتی ہے۔ تو فاسر ہے کہ یہ مردہ ہے۔ زندہ تو نہیں بہر حال اس کا بولنا قرآن کے تشابہات کی طرح ہے۔ اور اس حدیث کی اصل تاویل کسی کے پاس نہیں ورنہ اگر کاندھے کے پاس بولے تو اٹھانے والا کیوں نہ سنے گا۔ ہم نے آپ کے مضمون کے پیش کردہ دلائل کا بھی تجزیہ کیا۔ اور ان دلائل کی بھی اصل حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی۔ جو اس ذیل میں بار بار پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اب آپ کا فرض ہے کہ یا تو آپ رجوع فرمائیے یا پھر ہمیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطمئن کرنے کی کوشش کیجئے۔

امام احمد، امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر اور ایک جم غفیر ہے۔ جو مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے رُوح کے واپس آجانے کا قائل اور اسی دنیاوی قبر میں قیامت تک مُردہ پر عذاب یا راحت کے سارے احوال گزرنے کا اقراری ہے۔ دراصل یہی عقیدہ ان سب بڑوں کو کافر اور مشرک بناتا ہے اور دائرۃ اسلام سے خارج کر دیتا ہے دوسری طرف قرآن اور احادیث صحیحہ اجماع صحابہ امام ابوحنیفہ اور امام بخاری ہیں جن کا فیصلہ یہ ہے کہ رُوح بدن سے نکلنے کے بعد مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے واپس نہیں آسکتی ہے۔

اور نہ دنیاوی جسم سے اس کا لُحی قسم کا تعلق باقی رہتا ہے اور یہ قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں، ان میں جان کی رت تک نہیں ہوتی۔

امت کی بدفہمی ہے کہ آج کیفیت عذاب قبر کے اس عظیم مسئلہ کو فروعی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایمان یا کفر ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول کا معاملہ ہے۔ جو بھی یہ عقیدہ رکھے کہ دنیاوی قبر کے مُردے میں رُوح واپس آجاتی ہے۔ اسی کو اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے۔ سوال اور جواب ہوتا ہے۔ اور اب اسی پر قیامت تک دنیاوی قبر میں راحت کا دور جاری رہے گا۔ وہ ایمان سے خالی ہے۔

امید ہے کہ پہلی فرصت میں آپ زحمت فرماتے ہوئے تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں گے۔
(والسلام) (اشفاق)

جوابات

- ۱۔ اس خط کے لب و لہجہ سے ہٹ کر اگر خالص علمی محاسبہ کیا جائے تو میرے خیال میں اختلافی مسائل صرف دو ہیں۔ جو یہ ہیں:
 - ۱۔ قبر کا صحیح مقام کونسا ہے؟ زمینی گودھا، جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے یا برزخی قبر۔
 - ۲۔ سماع موتی میں کوئی استثناء بھی ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کئی نہ لُحی وقت اعادۃ رُوح کا امکان ہے یا نہیں؟
- میں اس بحث میں خاص اختصار پیدا کرنے کی خاطر یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث

کو صرف قرآن کریم اور بخاری شریف تک محدود رکھوں۔

(۱) مقامِ قبر؟

مقامِ قبر کے متعلق آپ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ مقام، جہاں میت کو عذاب و ثواب ہوتا ہے، یہ زمینی گڑھا نہیں بلکہ کوئی برزخی مقام ہے۔ جسے آپ برزخی قبر کہتے ہیں۔ یا برزخی قبر سے وہ نیا جسم مراد ہے جو میت کی روح کو مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظریہ کا کتاب و سنت میں ہمیں ذکر نہیں۔ صرف استنباطات کے ذریعہ اسے کشید کیا گیا ہے۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ بخلاف عقیدہ کے کہ اس کی بنیاد قطعی نصوص شرعیہ یا بالغافلہ دیگر کتاب و سنت کے واضح الفاظ پر ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی سامنے رکھیے کہ نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی صحت کو مختلف نتائج یا استنباطات کے ذریعے جانچا جاتا ہے جبکہ عقیدہ وہ ہوتا ہے جس کی اپنی حیثیت مسلم اور برقرار ہوتی ہے اور اس سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے!

اب دیکھیے ”برزخی قبر“ کا ثبوت قرآن یا کسی صحیح حدیث سے ملنا تو درکنار علمائے معتدین کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے، عقیدہ نہیں۔ پھر اس نظریہ کے نہ ماننے کی وجہ سے کسی کو بدعقیدہ، گمراہ یا مشرک و کافر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ اشفاق صاحب نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ، ”دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد یہی گڑھا لیا ہے جو صحیح نہیں“ (آپ کا خط ص ۱)

اور عجب بات یہ ہے کہ خود اشفاق صاحب کو بھی اس برزخی قبر کے محض ایک نظریہ ہونے کا اعتراف ہے۔ چنانچہ وہ اس خط کے ص ۴ پر لکھتے ہیں، ”اس کے بجائے اصلی سچائی یعنی برزخ کی قربان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اشفاق صاحب کے یہ الفاظ ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں کیونکہ اگر یہ ”اصل سچائی“ کتاب و سنت میں مذکور ہوتی تو آپ کو اس کے مان لینے کے لیے ایسی التجا کرنے کی ضرورت

قطعاً پیش نہ آتی۔

پھر اسی خط کے ص ۶ پر یوں رقمطراز ہیں ۱
 ”اس تضاد (یعنی اشفاق صاحب کا اپنا ذہنی تضاد، جس کا آگے چل کر جواب
 دے دیا گیا ہے) کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو برزخی جسم
 ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال
 اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔
 اشفاق صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اس ”اصل سچائی کو مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ
 ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس ”اصل سچائی کو ماننے سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے
 اور وہ یہ ہے کہ جب میت کو مرنے کے ساتھ ہی ایک نیا جسم مل گیا، جو کم از کم یوم البعث تک
 قائم و دائم اور عذاب و ثواب سے دوچار رہے گا۔ تو اس رُوح اور جسم کے انفصال ہی کا
 نام تو زندگی ہے۔ آخر یہ مستقل اور دائمی زندگی کہاں سے آگئی؟ جبکہ قرآن میں صرف دو زندگیوں کا
 ذکر آیا ہے؛ اسی طرح اس مستقل اور دائمی زندگی میں مسلسل عذاب کا نظریہ بھی درست نہیں۔
 قرآن میں تو اس برزخ کے عرصہ میں فرعون اور آل فرعون جیسے کافروں کے لیے بھی ”الْكَافِرُ
 يُعَذِّبُكَ اللَّهُ عَذَابًا غَلِيظًا“ کے الفاظ آتے ہیں جو عذاب کے تسلسل کو ختم کر
 دیتے ہیں۔ لہذا یہ نظریہ صحیح کیسے ہوا؟
 برزخی جسم؛

اس کے بجائے ہمارا نقطہ نظریہ ہے کہ رُوح کو کوئی نیا جسم نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا اپنا
 بھی جسم ہوتا ہے۔ فرشتے جب لمبی مرنے والے کی رُوح کو نکالتے ہیں تو یہ رُوح اپنی جسمیت
 سمیت مادی جسم کے بند بند سے نکلتی ہے۔ پھر فرشتے اسی جسمیت سمیت رُوح کو کپڑے میں
 پلیٹ کر آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور رُوح کا یہ جسم مادی جسم میں اسی طرح پھیلا ہوا ہوتا
 ہے، جیسے کوئلہ میں جلنے والی گیس یا زیتون کے درخت میں روغن زیتون۔ رُوح کا یہ جسم مرحلہ ۱
 میں بھی موجود تھا۔ جب ”أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ کا سوال و جواب ہوا۔ مرحلہ ۲ میں، ملائکہ میں
 اور ۳ میں غرض ہر مرحلہ پر رُوح کا جسم اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ البتہ مرحلہ ۲ اور ۳
 میں اسے ایک اضافی مادی جسم بھی ملتا ہے اور اسی اضافی جسم کی وجہ سے ان ہر دو ادوار کو
 زندگی کے ادوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رُوح کے اسی اپنے جسم کی وجہ سے ہم خواب میں ایک

دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح رُوح کا یہی جسم خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح عرصۂ برزخ میں یہی جسم عذاب و ثواب سے دوچار ہوگا۔ رُوح کے اس جسم کو آپ نیا برزخی جسم کہہ لیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ ورنہ رُوح کا اپنا مستقل جسم ہوتا ہے۔ جس کا عرصۂ برزخ سے چنداں تعلق نہیں۔

رُوح کا یہ جسم سستا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ لیکن اس کا یہ بولنا اور سنا ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں جو کچھ کہتا یا سنتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے جاگنے والے شخص کو اس کی گفت و شنید کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں کا عالم بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔

پھر جس طرح خواب میں کوئی شخص انتہائی تکلیف یا انتہائی انبساط میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات کبض دفعہ لبت پر لیٹے ہوئے جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح عرصۂ برزخ میں عذاب و ثواب سے دوچار ہونے والی رُوح پر جب شدت گزرتی ہے تو اس کے اثرات قبر میں پڑے ہوئے جسم تک بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جسم موجود ہو تو، ورنہ نہیں۔ گو یہ استثنائی صورتیں ہیں، مگر ان سے انکار ممکن نہیں۔ عام قانون یہی ہے کہ جس طرح خواب دیکھنے والے شخص کے رنج و راحت سے اس کا بستر پر پڑا ہوا جسم دوچار نہیں ہوتا، اسی طرح برزخ میں رُوح اور جسم پر جو واردات گزرتے ہیں قبر میں پڑا ہوا جسم اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

کیا علیتین اور سجدین برزخی مقام ہیں؟

اشفاق صاحب اور اسی طرح لکھنؤی صاحب کا خیال ہے کہ علیتین اور سجدین برزخی مقامات نہیں بلکہ وہ صرف رجسٹر ہیں جن میں اہل جنت اور اہل النار کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جہاں علیتین اور سجدین کا ذکر آیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب مرقوم کے الفاظ سے علیتین اور سجدین کی صفت بیان کی گئی ہے۔ لہذا برزخی مقام دراصل رُوح کا وہ نیا جسم ہی ہے جو اسے مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس نظریہ سے بھی اختلاف ہے کیونکہ جہاں کہیں بھی یہ رجسٹر اندراجات ہوں گے وہ کوئی مقام ہی ہوگا۔ پھر جہاں قرآن میں علیتین کا ذکر آیا ہے۔ وہاں

”کتاب مَرْتُوْمَرِ کے۔ اھ ”یُشْمِدُ الْمُقَرَّبُونَ“ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔
 یعنی جس مقام پر اہل جنت کا یہ رجسٹر ہے، وہاں مقرب لوگ (مرے ہوئے نیک لوگ،
 یا مقرب فرشتے) بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں سبب کا ذکر آیا ہے وہاں
 ”کتاب مَرْتُوْمَرِ“ کے ساتھ ہی ”وَبِلَّیْئُوْمَہِیْدٍ لِّلْمُکَذَّبِیْنَ“ کے الفاظ بھی
 آتے ہیں۔ یعنی اس اندراج کے دن ہی سے ان بھٹلانے والوں کی ہلاکت کا دور شروع
 ہو جاتا ہے۔ اندر میں صورت حال عظیم اور سببیں مقام نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ایسے
 مقامات ہیں جہاں صرف اہل جنت اور اہل النار کے نام ہی درج رجسٹر نہیں کیے جاتے،
 بلکہ وہی مقام ان رعوں کا اصل مستقر بھی قرار پایا ہے۔ اور انہی مقامات پر وہ عرصہ برزخ
 میں عذاب و ثواب سے تاقیامت دوچار ہوتے رہیں گے۔

قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

میں نے اپنے سابقہ مضمون ”مراسلات“ میں قبر سے مراد اسی زمینی گڑھا ہونے
 کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے سات دلائل دیے تھے جو یہ ہیں،
 ۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو عبد اللہ بن ابی منافق کے متعلق خطاب کرتے ہوئے
 فرمایا، ”وَلَا تَعْتَمِدْ عَلٰی قَبْرِہِ“ اب خدا اسے بتائیے کہ یہاں قبر سے مراد اللہ تعالیٰ
 نے یہی زمینی گڑھا لیا تھا یا آپ کی مرمومہ برزخی قبر؟ نیز خود رسول اللہ اور آپ کے
 صحابہ نے قبر کے لفظ سے یہ زمینی گڑھا مراد لیا تھا یا برزخی قبر؟ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ
 کو اس منافق کی اس زمینی قبر پر کھڑا ہونے کو کیوں ناپسند کیا تھا؟
 ۲۔ رسول اللہ کا مقتولین فلیب بدر کو وہاں پہنچ کر مخاطب کرنا۔ اگر یہ کنواں ان
 مشرکین کی حقیقی قبر نہ تھا تو آپؐ وہاں گئے کیوں تھے؟ جہاں پہلے موجود تھے، وہیں
 سے ان برزخی قبر والوں کو مخاطب کر لیا ہوتا؟

۳۔ رسول اللہ کا جنت البقیع میں جا کر شہداء کے لیے دعا کرنا اور
 ۴۔ آپؐ کا قبرستان میں یعنی انہی زمینی گڑھوں کے پاس جا کر مردوں کو
 ”السلام علیکم“ کہنا اور ان کے لیے دعا کرنا۔ آخر آپؐ کھڑے بیٹھے ہی السلام علیکم
 کیوں نہیں کہہ لیتے؟ کیونکہ ان کا قبرستان سے تو کوئی تعلق ہے نہیں۔ وہ تو برزخی
 قبروں میں رہتے ہیں۔

۵ تا ۷ - بخاری شریف سے تین احادیث بمعہ متن، ترجمہ اور حوالہ جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے، کو ہی ہم ”اصل سپائی“ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے مقابل برزخی قبر کا نظریہ مردود قرار پائے گا۔ اگرچہ ان حضرات کے نزدیک اس کے مزعومہ فوائد کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

شاخوں والی حدیث کا نیا مطلب :

ان سات دلائل میں سے صرف ایک حدیث کا اشتقاق صاحب نے جواب دیا ہے (اور وہ کرتے بھی کیا کہ اس پہلو سے عثمانی صاحب نے صرف ایک ہی حدیث کا جواب لٹریچر میں لکھا تھا) حدیث یہ تھی کہ :

”رسول اللہ بمعہ صحابہ کرام دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ جن میں دو میتوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ تو آپؐ نے درخت کی شاخ چیر کر اُدھی ایک قبر پر اور دوسری اُدھی دوسری قبر پر گاڑ دی۔ اور صحابہ کرامؓ کے پوچھنے پر آپؐ نے یہ وصاحت فرمائی کہ جب تک یہ ٹہنیاں سوکھ نہ جائیں شاید ان کا عذاب کچھ ہلکا ہو جائے۔“
اس کے جواب میں آپؐ نے لکھا ہے :

”اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک لکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی طرح آپؐ نے شاخیں لگا کر سمجھا دیا۔ رہا سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مردے دفن کئے گئے تھے ان پر یہ حالات گزر رہے ہیں اور یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔“
سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ کیا تھا؟ نبیؐ کو بذریعہ وحی ایک بات کی اطلاع ملی تو آپؐ نے یہ اطلاع صحابہ کرامؓ کو بھی دے دی۔ اس میں معجزہ کی کیا بات ہے؟ انبیاءؑ کی بعثت کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہر ایسی بات، جس کا انہیں بذریعہ وحی علم ہوتا ہے، وہ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح خیر بدکنے کی اصل وجہ بتلانا۔ یاد دہاکہ کی وجہ بتلانا جو انہیں بذریعہ وحی معلوم ہوتی ہیں، انہیں امت کو

بنانا ہی انبیاء کا کام ہوتا ہے۔ اس میں معجزہ کی عبادت ہے کم از کم ہم تو نہیں سمجھ سکے معجزہ تو جب ہوتا اگر صحابہ کو ائمہ بھی اس عذاب کو ہوتے دیکھتے یا سن لیتے۔ معجزہ ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو نبی دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور دوسرے لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ نبی کے بدریہ وحی علم کو معجزہ کہنا کیسے درست سمجھا جاسکتا ہے؟

اور یہ تختہ سیاہ والی بات بھی خوب رہی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو بھی پوری نہیں تو کم از کم آدھی قبر آپ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ برزخی قبر کا تعلق سننے سنانے سے ہے لیکن جہاں تک دیکھنے دکھانے اور لکھ کر بتانے کا تعلق ہے تو یہ کام اس زمینی گڑھے والے تختہ سیاہ ہی سے لیا جائے گا۔ پھر اگر بفرض تسلیم اس نظریہ برزخی قبر کو مان بھی لیں تو بھی اس سے اتنا تو بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اس برزخی قبر سے اس زمینی گڑھے کا کچھ نہ کچھ تعلق ہے ضرور۔ جہاں تک عذاب قبر سے متعلق باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ اور یہی کچھ ہم سمجھتے ہیں!

برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط:-

اس نظریہ کا استنباط یوں کیا گیا ہے کہ قرآن میں ہے ”ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ“ یعنی ہر شخص کو مرنے کے بعد قبر ملتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ قبر میسر نہیں آتی۔ کچھ لوگ ڈوب جاتے ہیں انہیں پھلیاں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ بعض دوسروں کو حلا کر راکھ بنا دیا جاتا ہے۔ تو انہیں قبر کہاں ملی؟ جبکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کو قبر ملتی ہے۔ لہذا ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے“ کے تحت برزخی قبر کا نظریہ قائم کیا گیا۔ برزخ کا لفظ بھی قرآن کریم میں ایک دو بار آیا ہے اور قبر کا لفظ تو بہت مقامات پر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے ملانے سے برزخی قبر کی اصطلاح بن گئی۔ اب اگر یہ نظریہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہوتا تو کم از کم الفاظ تو قرآنی ضرور ہیں۔

اور اس نظریہ کو اپنانے کی وجہ یہ بنی کہ حضرات اس سنت الہی کہ ”مرنے کے بعد ایسے قبر دی“ میں کمی استثنائے کے قائل نہیں۔ حالانکہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کوئی سنت الہی ایسی نہیں جس میں استثناء نہ ہو۔ قرآن میں صرف ایک سنت الہی

کے متعلق چار مقامات پر آیا ہے کہ ”فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا... وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا“ اور وہ سنت الہی یہ ہے کہ جو قوم بد اعمالوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کا عذاب ضرور آتا ہے۔ لیکن اس موثق سنت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ”إِلَّا قَوْمًا يَتُونُوا“ فرما کر استثناء کی صورت پیدا کر دی ہے۔

اب دیکھیے سنت الہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو قبر ملتی ہے اور اس سے بھی زیادہ موثق سنت الہی یہ ہے کہ موت بھی صرف دو بار ہے۔ اور زندگی بھی دو بار۔ تو پھر جب اس موثق سنت الہی میں استثناء کی صورتیں قرآن سے ثابت ہیں۔ جیسے کہ میں اپنے مقالہ میں وضاحت سے پیش کر چکا ہوں۔ تو اس ”مرنے کے بعد قبر ملنے کے“ قانون میں استثنائی صورتوں کو تسلیم کرنے میں آخر کیا چیز مانع ہے؛ اور یہ استثنائی صورتیں یہ ہیں کہ کچھ لوگ دُوب کر مَر جاتے ہیں، بعض کو درندے بھاڑ کھاتے ہیں، کچھ دُوسروں کو جلادیا جاتا ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود عام اصول یہی ہے کہ مرنے والے کو اللہ تعالیٰ قبر دیتا ہے اور ابتدائے آدمؑ سے انبیاءؑ کی یہی تعلیم رہی ہے کہ مردوں کو قبر میں دفن کیا جائے۔ اور یہی چیز احترامِ انسانیت ہے۔ پھر اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ہر مرنے والے کو مرنے کے ساتھ ہی عذاب و ثواب قبر شروع ہو جاتا ہے اور عذاب و ثواب کے لیے رُوح کے ساتھ جسم ہونا لازمی ہے۔ پھر

جن لوگوں کا جسم ہی باقی نہ رہا ہو انہیں عذاب و ثواب کیونکر ہوگا؟ پھر قرآن میں فرعون کے ذکر میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے جسم کو نجات دی جائے گی اور یہ بھی ہے کہ فرعون اور آل فرعون سب کو مرنے کے بعد عذاب پر پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تطہیق کیسے ممکن ہے؛ لہذا ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مرنے کے بعد رُوح کو ایک نیا بدن ملتا ہے۔ اور یہی جسم اس کی بدنہی قبر ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں رُوح کو کبھی نئے جسم کی ضرورت نہیں۔ رُوح کا اپنا بھی ایک جسم ہے۔ جس کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات :

قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے پر عثمانی صاحب اور اسی طرح موجودہ دور کے بعض دیگر لوگوں کو مندرجہ ذیل قسم کے اعتراضات ہیں۔

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغچہ ہوتا ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک ہی قبر میں کئی مردے دفن ہوتے ہیں۔ اب بتلائیے کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے یا ثواب ؟

۲۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب منکر نکیر آتے ہیں تو مردے کو قبر میں بٹھلا دیا جاتا ہے۔ پھر مومن کے لیے یہ قبر کشادہ کی جاتی ہے حالانکہ اس زمینی گڑھے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لہذا ضروری ہے کہ اس سے برزخی قبر ہی مراد لی جائے۔

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ستر ایسے زہریلے سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کو ڈس لے تو زمین سبزہ آگاہا چھوڑ دے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ زمین نے آج تک سبزہ آگاہا تو چھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینا درست نہیں۔

۴۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ قبریں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری دعا سے وہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایک قبر میں نیک و بد دونوں قسم کے مردے ہوں تو کیا صورت ہوگی ؟ کیا ان سب کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا ؟

۵۔ زانیوں کی قبریں دنیا میں مختلف مقامات پر ہوتی ہیں لیکن رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں ایک ہی جگہ ایک نور میں عذاب ہو رہا تھا وغیرہ۔

اعتراضات کے جوابات

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب دراصل میں اپنے مقالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے اپنے مخصوص قسم کے نکات پر ہی نظر ڈالی۔ لہذا اب اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک کمرے میں دو آدمی سو رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو خواب کی حالت میں پٹ رہا ہے لیکن دوسرا خواب ہی میں دھڑلے اٹھ رہا ہے اور ایک تیسرا

آدمی ان دونوں کے پاس بیٹھا جاگ رہا ہے۔ اب دیکھئے یہ تینوں آدمی ایک دوسرے اور میرے کے حالات سے قطعاً بے خبر ہیں کیونکہ تینوں کے عالم الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ہمارے محسوسات کے لحاظ سے تینوں ایک ٹرے میں، ایک مقام پر اور ایک عالم نہ دنیا میں ہیں۔

عالم برزخ کا تصور بہت تقویر و تخیل کا ہے۔ اس عالم دنیا میں ممکن ہے، خواب اور اس کے کوائف و واردات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ نیند بھی زندگی اور موت کے درمیان برزخ ہے اور اسی لیے نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند میں چونکہ زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اس کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور برزخ میں چونکہ موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار پائے جاتے ہیں اسی لیے اس موت کے دُور کو برزخی زندگی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

اس تصریح سے عثمانی صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیا رُوحیں ڈوبیں؟ ایک تو مذاب و ثواب جگت رہی ہے اور دوسری دنیا میں اپنے قبر میں پڑے ہوئے جسم میں موجود ہوتی ہے تو کیا رُوحیں وہم ہوتی ہیں؟ اگر اس دنیا میں اس طرح کی مدہ رُوحوں کے وجود کا امکان ہے تو اس دنیا میں کیوں ہو سکتا؟ ایک رُوح سوتے ہوئے ان کے جسم میں ہوتی اور دوسری آسمانوں کی سیر کرتی پھرتی ہے۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ایسے زہریلے ستر سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں ایک سانپ زمین کو ڈس لے تو وہ سبزہ اگانا چھوڑ دے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین نے سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔

یہ بھی عجیب قسم کی منطق ہے کہ سانپ ڈسے تو انسان کو اور سبزہ اگانا زمین چھوڑ دے؟ وہ کیوں؟ آخر اس سانپ نے زمین کو تو ڈسا نہیں، پھر جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ مذاب و ثواب قبر کا بیشتر انحصار رُوح یا رُوح کے جسم پر ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شدت سے کبھی کبھار قبر میں پڑا ہوا جسدِ منصری بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ تو بدکردار انسان کے اس مذاب سے آخر زمین سبزہ اگانا کیوں چھوڑ دے؟

یہ اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات میں عام غلطی جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بات تو کرتے ہیں رُوح اور عالم برزخ کی، اور اسے پرکھنا چاہتے ہیں انسانی عقل اور محسوسات

سے، حالانکہ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ رُوح کے متعلق انسان کو بہت قحطِ علم دیا گیا ہے۔ تو پھر اس قحط سے علم کی بنیاد پر ایک نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اس میں اتنا غلطی اور متعصب ہو جانا کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف بات کرے اسے کافر و مشرک کے القاب دے ڈالنا، آخر یہ کس کی دانشمندی ہے؟

شہداء اور عالم برزخ؛

شہداء کے متعلق قرآن کریم میں ایک جگہ تو یہ مذکور ہے کہ انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ مُندہ ہیں۔ (التہقۃ) اور دوسری جگہ فرمایا کہ "اشد کی راہ میں مارے جانے والوں کو مُردہ لگان بھی نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔" اور اعلیٰ سے ثابت ہے کہ شہداء کو سبز رنگ کے پزیدوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جنت کے باغوں میں اہلہاتے، جنت کے میوے کھاتے اور عرش الہی کے نیچے لٹکتی ہوئی سنہری قندیلوں میں لیسر اکتے ہیں۔ (الوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۲۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخی زندگی تو سب ہی کو ملتی ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہر کوئی عذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوتا ہے تو پھر شہداء کی خصوصیت کیا رہی؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ انہیں مُردہ نہ کہو یا نہ سمجھو محض ازراہ اعزاز ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات محض ازراہ عزت و احترام نہیں۔ بلکہ وہ فی الحقیقت زندگی کے دور میں ہیں جیسا کہ قرآن میں دونوں مقامات پر بَلِّ آخِیَاء کے الفاظ آئے ہیں جبکہ باقی سب انسانوں کے لیے اَمْتَوَاتٌ خَیْرٌ آخِیَاء کے الفاظ آئے ہیں۔ اور شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان پر سے مرحلہ مٹ یعنی مرنے کے بعد سے لے کر یوم البعث تک کا دور۔ جسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں اور قرآن اسے موت کا دور بتلاتا ہے، یکسر اٹھالیا جاتا ہے اور وہ مرحلہ مٹ یعنی دنیوی زندگی میں شہادت پاتے ہی فوراً سیدھے مرحلہ مٹ یعنی مکمل اور دائمی زندگی کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان سے منکر غیر کے سوال و جواب نہیں ہوتے۔ قرآن کریم کے الفاظ بَلِّ آخِیَاء کا یہی مطلب ہے جبکہ عثمانی صاحب شہداء کی برزخی زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

”اس طرح سے صاف بتلادیا گیا کہ شہدار اپنے رب کے پاس ہیں اور وہاں
 رزق پارہے ہیں۔ ان قبروں کے اندر زندہ نہیں۔ ان کی زندگی برزخی
 ہے دنیاوی نہیں“ (یہ قبریں یہ آستانے ص ۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہدار کی زندگی بھی برزخی ہے اور عام انسانوں کی بھی،
 تو عام انسانوں کے لیے اَمْوَاتٌ غَیْثٌ اَحْیَاءٌ اور شہدار کو بَلْ اَحْیَاءٌ کیوں
 کہا گیا؟

موت کے بعد شہدار اور عام انسانوں میں دو سرفرق یہ ہے کہ شہدار کو
 جنت میں سبز پرندوں کا جسم عطا ہوتا ہے اور یہ جسم حقیقی اور مستقل ہوتا ہے جبکہ
 دوسروں کی رُوح کو ان کا اپنا ہی جسم یا بقول عثمانی صاحب نیا جسم عطا ہوتا ہے جو
 ہر آن بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

۲-۱- اعادۃ روح اور عذاب قبر

اعادۃ روح کے متعلق بختمی بھی احادیث آتی ہیں، عثمانی صاحب نے ان کو
 یا تو مجرد و موضوع قرار دیا ہے یا پھر ان کی کوئی نئی اور مضحکہ خیز تاویل پیش کر دی
 ہے۔ اثبات اعادۃ روح کے موضوع پر ایک الگ مفہم شائع ہو چکا ہے
 جس میں عثمانی صاحب کی ان علمی تحقیقات کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا، مگر دست
 ہم صرف بخاری کی اسی حدیث سے تفرص کریں گے جو موضوع زیر بحث میں اکثر
 پیش کی جاتی ہے۔ پھر اس سے ممکنہ نتائج پر غور کریں گے۔ حضرت انس بن مالک
 سے روایت ہے کہ :

”اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ، اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ
 فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ اَصْحَابُهُ اِنَّهُ لَيَسْمَعُ قُرْعَ نَعَالِهِمْ
 اَنَّهُ مَلَكَانٌ فَيَقْعِدَانِهِ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي
 هَذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُتُومِنُ فَيَقُولُ اَشْهَدُ اَنَّ
 عَبْدَ اللَّهِ وَرَسُولُهُ فَيَقَالُ لَهُ اِنْظُرْ اِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ
 النَّارِ قَدْ اَبَدَ لَكَ اللَّهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا
 جَمِيعًا۔ قَالَ قَتَادَةُ وَذَكَرْنَا اَنَّهٗ لَيُفْسَحُ لِرُفْقِ قَبْرِهِ ثُمَّ

وَجَعَلَ إِلَىٰ حَدِيثِ أَنَسٍ قَالَ: وَأَمَّا الْمَنَافِقُ وَالْكَاذِبُ فَيُقَالُ لَهُ: مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهُ: لَا دَرِيَّةَ وَلَا تَكَلَيْتَ فَيُضْرَبُ بِمِطَارِقٍ مِنْ حَدِيدٍ صَرْبَةً فَيُصَيِّحُ صَيْحَةً يَسْمَعُ بِهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ“ (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، جب آدمی اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس لوٹتے ہیں تو بلاشبہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے (اسی وقت) اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، ”تو اس شخص یعنی محمدؐ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟“ اب اگر وہ ایماندا ہے تو کہتا ہے، کہ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“ پھر اس سے کہا جاتا ہے۔ ”تو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے اللہ تعالیٰ نے اس کے بدل تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا۔“ تو وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ قتادہ کہتے ہیں ”اور ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔“ پھر انس کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ”اور اگر وہ منافق یا کافر ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے؟ تو وہ کہتا ہے۔ ”میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔“ پھر اس سے کہا جاتے گا کہ ”تو تو خود سمجھا اور نہ ہی خود پڑھا۔“ اور لوہے کے ہنڑوں سے اسے ایسی مار پڑے گی کہ وہ بلبلا اٹھے گا۔ اور اس کی یہ چیخ جتن د انسان کے سوا تمام آس پاس کی چیزیں سلتی ہیں“

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں،

۱۔ ”بنیادی طور پر ”وَضِعَ“ کا لغوی معنی ”آنا اور نیچے رکھنا ہے۔ (مفردات لُغِیہ) اور وَضِعَ فِي قَبْرِہ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قبر سے مراد وہی زمینی

گڑھا ہے۔ رُوح کو عسی برزخی جسم میں داخل کرنے کے لیے ”وَضِعَ“ کا لفظ استعمال نہیں ہو گا۔

۲۔ ”وَتَوَلَّیْ عَنْهُ اَحْصَابُهُ“ کے الفاظ سے بھی قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے کیونکہ میت کے ساتھی اسی زمینی قبر سے واپس جاتے ہیں نہ کہ برزخی قبر سے۔

۳۔ جنّ والنس کے سوا تمام اشیاء میت کے عذاب آہ و بکا کو سہتی ہیں۔ جنّوں کے متعلق ہم و لوق سے کہہ نہیں سکتے۔ لیکن انسان تو اسی زمین پر بستے ہیں اور مَٹَبْ یَلِیْهِ کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ اس قبر کے آس پاس کی اشیاء اور

جنّ والنس ہیں۔ اب انسان چونکہ اسی زمین کے پاس ہو سکتے ہیں۔ برزخی قبر کے پاس نہیں ہوتے۔ لہذا قبر سے مراد بھی زمینی گڑھا ہے۔

”اِنَّهُ لَیَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ“ (یعنی مُردہ ان واپس جانے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے) کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس جسم میں رُوح بھی ہوتی ہے۔ جو موت کے وقت فرشتے نکال کر لے گئے تھے۔

اس سے اعادۂ رُوح کا اثبات ہوتا ہے۔ اب یہ سوال کہ رُوح فرشتے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یا یہ رُوح ان کی آمد سے پہلے لوٹائی جاتی ہے۔ اور پھر یہ رُوح واپس کب اور کس طرح جاتی ہے؟ ایسے سوال ہیں جن کے جاننے کے ہم مکلف نہیں ہیں۔ اور یہ سوال ایسے ہی ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ عیسیٰ مہینِ مُردوں کو زندہ کرتے تھے، وہ دوبارہ کب مرتے تھے؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ رُوح کا اصل ٹھکانا یہ دنیاوی قبر نہیں ہے اور رُوح کی یہ واپسی ایک اضطراری امر اور اللہ کے حکم کے تحت ہے۔

۵۔ ”فَیُحْیِیْہِ اِنَّہُ“ یعنی وہ دونوں فرشتے قبر میں لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ فرشتوں کے اس عمل سے بھی قبر کے زمینی گڑھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ برزخی قبر تو محض رُوح کو ایک نیا جسم ملنے کا نام ہے اور یہی نیا جسم اس کی برزخی قبر ہے۔ اس برزخی قبر میں فرشتوں کے میت کو اٹھا کر بٹھلانے کا تصور ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ ”قبر میں فرشتے نیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ نیز مومن کے لیے قبر کھول دی جاتی ہے۔“ اس سے عثمانی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ قبر کو اسی

وقت اکھاڑنے سے ہم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں دیکھتے۔ لہذا قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں ہو سکتا اور اس سے مراد بس برزخی قبر ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس سے بالکل دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قبر کی اندرونی دنیا، اس کی خارجی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قبر میں رکھی ہوئی میت سے جو روایات و حوادث پیش آ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے قبر کو اکھاڑنے والا شخص کبھی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں نہایت سسنی خیز حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بیٹھنے اور جاننے والے کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ دونوں اسی دنیا میں اور ایک ہی جگہ پر ہوتے ہیں۔ لہذا برزخی قبر کے نظریہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہ بات میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اس دنیا میں خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے مادی جسم سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ لہذا اس پر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن قبر یا عالم برزخ میں اس رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے جسم سے تعلق نہایت کمزور اور کبھی کبھار ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق بھی رُوح کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہذا اس دور کو اَمَواتٌ غَیْبٌ اَحْیَاءٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ روایت درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قبر میں اعادۂ رُوح کے قائل ہیں۔ پھر انہوں نے یہ روایت ایک ممتاز صحابی حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالکؓ بھی اعادۂ رُوح کے قائل تھے۔ پھر درمیان میں جتنے حضرات سے اس کا سلسلہ سند منسلک ہے، یہ سب حضرات بھی اعادۂ رُوح کے قائل تھے۔ پھر آخر امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ، ابن حجرؒ اور ایک جہم غفرؒ نے کونسا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ انہیں بدعتیہ، گمراہ، کافر و مشرک اور ایمان سے خالی وغیرہ وغیرہ القابات سے نوازتے ہیں؟ اب آپ کے ممد و ملین میں سے ایک امام ابو حنیفہؒ رہ جاتے ہیں جن کے سوال و جواب کو غلط جامہ پہنا یا جارہا ہے۔ جہاں تک رُوح کے قبر میں واپس آنے اور پھر ہر وقت موجود رہنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اصل سوال زیر بحث یہ ہے کہ کیا کسی وقت اعادۂ روح ممکن ہے یا نہیں، خواہ بعض استثنائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں کسی صحابی، امام بخاری یا امام ابو حنیفہؒ کا قول پیش فرمائیے۔ تو قطع نزاع کے لیے دلیل کا کام دے سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے واقعہ سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح قبر میں ہو جوتی نہیں ہوتی۔ بلکہ اہل قبورِ اَمْواتِ غَيْرُ اَحْيَاءِ ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کسی صحابیؒ، امام بخاریؒ یا امام ابو حنیفہؒ، بلکہ ان کے علاوہ علمائے متقدمین میں سے کسی ایک کا نام بتلا سکتے ہیں جس نے قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے کی بجائے آپ کی مرقومہ برزخی قبر لیا ہو؟

ہم نے یہاں بخاری سے صرف ایک حدیث عذابِ قبر سے متعلق درج کی ہے جبکہ دوسری کتب صحاح میں بھی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ پھر ایسی صحیح روایات کے علی الرغم ہم اس استثنائی صورت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اسی زمینی قبر میں فرشتے آتے ہیں تو میت کی رُوح واپس قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اسی زمینی گڑھے میں فرشتے سوال و جواب کرتے ہیں اور یہیں سے میت کو عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ ہم میت کے جسم سے اس کی رُوح کے اس استثنائی، کمزور اور غیر مستقل تعلق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا میں خواب کی صورت میں اس سے ملتی جلتی باتیں مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں اور یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا ہے ہی نہیں؟ اسی طرح اس زمینی گڑھے میں ہونے والے سوال و جواب اور عذاب و ثواب سے قطعی انکار ہمارے لیے ناممکن ہے۔

قَوْلُ نِعَالِہُمْؑ کی عثمانی تشریح :

”قَوْلُ نِعَالِہُمْؑ کی شرح میں آپ کو بخاری کے کسی شارح الزین بن المنیر کی شرح بہت پسند آئی ہے اور اس شرح کا اشفاق صاحب نے بھی اپنے خط میں ذکر

لیا گو ہم ساری موتی کے مسئلہ میں ان سب حضرات سے کئی طور پر متفق نہیں۔ تاہم ہم ان کے لیے ایسے غلط قسم کے القابات کسی صورت پسند نہیں کرتے۔

فرمایا ہے۔ اور وہ شرح یہ ہے کہ ”نَعَالِهِمْ“ میں ”هُمْ“ کی ضمیر بعد میں آنے والے الفاظ ”أَنَا هَٰؤُلَاءِ مَلَكَانِ“ کی طرف پھرتی ہے۔ اب اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی وارد ہوتے تھے۔ جن کے جواب بھی عثمانی صاحب نے دیے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اعتراضات اور ان کے جوابات چونکہ علمی انداز کے ہیں، اس لیے ہم ان کا جلد نذر لینا چاہتے ہیں۔

اعتراض ۱۔ ”هُمْ“ جمع کی ضمیر ہے۔ اگر اس سے مراد فرشتے ہوتے تو تنذیر کی ضمیر ”هُمَا“ آنا چاہیے تھی۔

اس کا جواب عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ ”عربی زبان میں دونوں طریقے رائج ہیں۔ تنذیر کے لیے جمع کا استعمال عام ہے جیسے قرآن کی آیت ہے:

”قَالَ كَلَّا فَإِذَا هَبَا پَايِلَتَنَا أَنَا مَعَكُمْ مُسْتَمْعُونَ“ (شعشعہ)

”فرمایا، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر۔ ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔“

”فَإِذَا هَبَا“ میں تنذیر کی ضمیر ہے اور ”مَعَكُمْ“ میں جمع کی۔

اسی طرح بخاری کی حدیث خضر میں یہ الفاظ ہیں:

”فَمَرَّتْ بِهَمَا سَفِيلَتُهُ فَاكَلَمُوهُمَا أَن يَخْبِلُوهُمَا“

”پس گزری ان دونوں (موسیٰ و خضر) کے پاس سے ایک کشتی، پس انہوں نے (جمع کا صیغہ) کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان دونوں کو کشتی

میں سوار کر لیں“ (بخاری عربی جلد ۲۳، سطر ۱۱۵، ۱۱۶)

”فَاكَلَمُوهُمَا“ کے ساتھ ساتھ ”فَاكَلَمَاهُمَا“ بھی بخاری کی روایت میں ہے

مگر حاشیہ پر اور نسخہ کے طور پر متن میں ”فَاكَلَمُوهُمَا“ کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ تنذیر کے بجائے جمع کا صیغہ ہے۔“

جواب:

عربی زبان میں تنذیر کے لیے جمع کا صیغہ عام نہیں۔ اگر عام ہوتا تو گرامر کی کتابوں میں اس کا ضرور ذکر پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تنذیر کی صورت میں جمع کا استعمال نادر ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے مثلاً:

پہلی مثال میں ”كُفُّوا“ کی ضمیر جمع کی وجہ سے آئی ہے۔ گویا فرعون کی طرف

جانے والے تو صرف دو تھے مگر سننے والوں میں امیر بھی ساتھ شامل ہو گیا اور ضمیر جمع میں بدل گئی۔ دوسری مثال میں ایک مقام پر **كَلَّمُوْهُمَّ** اس لیے آیا ہے کہ موسیٰ کے ساتھ ان کا ایک ساتھی (یوشع بن نون) بھی تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن قابل ذکر چونکہ وہی ہستیاں تھیں یعنی موسیٰ و خضرؑ اس لیے اکثر تثنیہ کا ضمیر آیا اور ایک جگہ اشتباہ کی وجہ سے جمع کا ضمیر بھی آیا۔ اگرچہ اس کی حاشیہ میں تصحیح کر دی گئی۔

اعترض ۲: **هَمْ** کی ضمیر **اَلْمَلٰٓئِکَہٗ** سے متعلق ہے تو یہ پہلے کیسے آگئی؟ اس کا جواب عثمانی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:

عربی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بات بالکل صاف ہو اور سننے والے سے غلطی کرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پہلے اسم کا ذکر نہیں کیا جاتا جیسے قرآن

میں ہے:

”اِنَّا اَنْشَاْنٰهُمْ اِنْشَاءً فَبَعَلْنٰهُمْ اَنْبَکَارًا“ (۳۶، ۳۷)

”ہم نے ان کو (ان کی بیویوں کو) ایک خاص اٹھان سے اٹھایا ہے اور ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں۔“

یاسورہ یسین میں:

”وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ“ (۹۶)

”اور ہم نے اس (پیغمبرؐ) کو شعر کی تعلیم نہیں دی“

جواہر پہلی مثال اس لحاظ سے غلط ہے کہ ”اِنَّا اَنْشَاْنٰهُمْ“ سے چند آیات پہلے **وَجُوْرَعِيْنٌ کَاْمَثَالِ اللُّوْلُوْءِ الْمَكْنُوْنِ** کا ذکر آچکا ہے۔ بعد میں جنت کی چند صفات بیان کر کے ”اَنْشَاْنٰهُمْ“ کی ضمیر **جُوْرَعِيْنٌ** کی طرف پھیری گئی ہے جو درست ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اسے خواہ مخواہ ”اَنْبَکَارًا“ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ لفظ بعد میں آیا ہے۔

جواہر پہلی مثال تو ایسی درکار تھی کہ ضمیر پہلے آئے اور اس کا مرجع اسم بعد میں ہو۔ پہلی مثال میں آپ نے بعد میں مرجع ”اَنْبَکَارًا“ جو بتلا یا ہے، وہ ویسے ہی غلط ہے اور دوسری مثال میں ضمیر کا مرجع اسم مذکور ہی نہیں۔ تو لڑا کر صاحب کا جواب

درست کیسے سمجھا جائے؟

اب دیکھیے کہ ”قَسَمٌ بِغَالِيهِمْ“ کا مرجع ”اَصْحَابُہُ“ واضح طور پر جب موجود ہے تو ”هُم“ کا مرجع آخر ”مَلَکَکَیْنِ“ کیوں قرار دیا جاتے؟ لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کو الزین بن المنیرؒ کی تشریح اس لیے پسند آگئی کہ یہ آپ کے نظریہ کی آئندہ کتنی تھی۔
سماع موتی کے متعلق قول فیصل:

قرآن کی رو سے یہ ثابت ہے کہ مردے سن نہیں سکتے اور ہم خود بھی اسی بات کے قائل ہیں! — پھر قرآن ہی کی رو سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس قانون الہی میں بھی استثناء موجود ہے اور وہ استثناء یہ ہے کہ ”إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ“ یعنی ”اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سُننا سکتا ہے“ اب اگر سماع موتی کا یکسر انکار کر دیا جائے تو ”سماع موتی“ کا از خود انکار ہو گیا۔ گویا یہ مسئلہ صرف ”سماع موتی“ کا نہیں بلکہ سماع موتی کا بھی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو سُننا تو سکتا ہے مگر سُننا یا کہی نہیں تو یہ بات بھی یکسر غلط ہے۔ قلبِ بدر کے مقتولین کو اللہ تعالیٰ نے سُننا دیا تھا، یعنی اللہ کے اذن سے مردوں کو ”قَسَمٌ“ کہتے تھے تو وہ مردے یہ حکم سُن کر ہی جی اٹھتے اور اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گویا ایسے واقعات کا اندازہ معجزانہ ہی سہی لیکن ان کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ پھر چونکہ ”سماع موتی“ اور ”سماع موتی“ دونوں لازم و ملزوم ہیں لہذا ”سماع موتی“ بھی استثنائی صورتوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ گویا عام قاعدہ یہی ہے کہ مردے سُن نہیں سکتے۔

نظریہ ”برزخی قبر“ کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت،
 عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ،

”دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات“ حیات فی القبر کے ہم معنی اور قبر پرستی کے شرک کی اصل اور بنیاد ہے“ (عذابِ قبر ص ۲۶)

اب دیکھیے جہاں تک شرک کی اصل بنیاد کے استیصال کا تعلق ہے، ہم بدل و جان عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وہ شرک کی اصل بنیاد اس دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات اور حیات فی القبر قرار دیتے ہیں جبکہ ہم شرک کی اصل بنیاد سماعِ موتی کا علی الاطلاق وقوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ

درج ذیل ہیں:

۱۔ قبر میں زندگی اضطرابی امور سے تعلق رکھتی ہے۔ دائمی اور مستقل ہرگز نہیں ہوتی۔

میت یا اس کی روح کا اس میں کچھ اختیار یا عمل دخل نہیں ہوتا۔

۲۔ پھر یہ نامکمل سی زندگی بھی ایسی ہے جس کا صحیح فہم ہمارے عقل و حواس سے ماوراء ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور ہے اور یہ عالم اور۔ لہذا ان کی یہ زندگی بے کار ہے۔ نہ ہم انہیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں۔ نہ وہ ہماری بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں یا جواب دے سکتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کا ہمیں کیا فائدہ یا نقصان ہے؟ ان کی اس زندگی میں اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم فرشتے ہی انہیں کچھ سنا، یا دہ ان سے کچھ سن سکتے ہیں یا سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ جو شرک کی بنیاد ملتا ہے وہ سماج موتی کا ہے نہ کہ دنیوی قبر میں عذاب و حیات فی القبر! ————— لہذا ہماری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی جملہ مساعی و اعمال موتی کی تردید میں صرف کیجئے۔ ان شاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔



سماع موتی سے تصرفاتِ اولیاء تک

مسائل (۳)

بلسلہ روح، عذابِ قبر اور سماع موتی

(یہ جوابات محدث کی تین اقساط جامی الآخِرہ مجب اور شعبان رمضان ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)

سماع موتی سے بیکرا لکار کرنے والوں کے بعد اب سماع موتی کے قائلین کی طرف سے اعتراضات کی باری آتی۔ اس سلسلہ میں جو بدی محمد علی صاحب حنفی (پکا ڈیرہ و ٹرانچال کوٹ رنجیت ضلع شیخوپورہ) کی طرف سے ادارہ محدث کے نام ایک طویل ترین خط موصول ہوا۔ جو خط سے زیادہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی آخر میں یہ آرزو بھی کی گئی ہے کہ:

”آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ ”محدث“ جو کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے، تصویر کا دسرا نسخہ بھی شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ تاکہ ”محدث“ کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں۔“

یہ خط یا مضمون فل سکیپ کے مکمل دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، تحریر گنجان ہے جو محدث کے لم و بیش ۲۵ صفحات کا متقاضی ہے۔ پھر اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ صفحات جواب کے لیے بھی درکار تھے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ایک ماہوار رسالہ ایک قسط میں تو یہ سب کچھ شائع نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر ایک قسط میں صرف یہ خط یا مضمون شائع کیا جاتا اور اگلے پرچے میں جوابات دیے جاتے تو قارئین کو تقابل میں دقت محسوس ہوتی۔ اور اگر خط کا محض خلاصہ میں اپنی طرف سے

پیش کر کے اس کے جوابات قلمبند کر دیتا۔ تو مضمون نگار کی طرف سے اعتراضات کی گنجائش باقی رہتی۔ لہذا مضمون نگار کی آرزو کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس مکمل خط یا مضمون کو اپنی صورت شائع کیا جائے کہ پہلے اس کا ایک حصہ من و عن نقل کرنا جائے پھر اس کا جواب لکھ دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر یہ مکمل مضمون بمعہ جوابات دو یا تین اقساط میں بھی شائع ہو، تو قارئین وارد شدہ اعتراضات کے ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔ جواب لکھنے میں میں نے حتی الوسع اختصار سے کام لیا ہے اور صرف ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے جن کا جواب دینا ضروری تھا اور جن پر حواشی کے نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ پھر اسی ترتیب سے ان کا جواب بھی لکھا گیا ہے۔ جبکہ اصل مضمون کا من و عن شائع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ صاحب مضمون کو یہ حسرت نہ رہ جائے کہ ان کا مضمون قطع و برید کے ساتھ یا تو طر مڑ کر شائع کیا گیا ہے۔

(عبد الرحمن کیلانی)

سماع موتی۔ تصویر کا دوسرا رخ

محرمی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ ”محدث“ لاہور

سلام مسنون! چند ماہ سے آپ کے رسالہ ”محدث“ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں اور محدث میں چھپنے والے معیاری علمی مضامین سے کافی متاثر ہوں۔ اس وقت میرے سامنے آپ کے ماہنامہ ”محدث“ بابت ۵ دسمبر ۱۳۹۲ء، ماہ جنوری ۱۳۹۳ء کے شمارے ہیں۔ جن میں جناب مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب کا مضمون ”روح، غدا، قبر، سماع موتی“ قسط دار شائع ہوا ہے۔ جس میں کیلانی صاحب نے قائلین سماع کے دلائل سے مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ اسی سلوک نے مجھے آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ بخشا ہے تاکہ کیلانی صاحب کو ان حقائق سے روشناس کرایا جائے، جنہیں مولانا موصوف نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔

عہ اس کتاب میں ترتیب بدل دی گئی ہے اور پیش لفظ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے

مولانا کیلانی صاحب نے قرآن مجید کی چند آیات اور چند احادیث کے حوالہ سے جو رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

سماع موفیٰ ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا چور دروازہ ہے (گویا قائلین سماع شرک ہیں۔)

غائب شدہ بزرگوں کو پکارنا ان کی عبادت کے مترادف ہے۔ غیب یافتہ بزرگ کسی کی پکار کر جواب دینا تو درکنار ان کی بات بھی نہیں سن سکتے۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ زندہ نہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں اور انہیں اپنی ذات سے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟

اس مسئلہ میں قرن اول میں اختلاف موجود تھا۔ حضرت قتادہ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موفیٰ کے منکر تھے۔ قلیب بدر والی حدیث حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ جن احادیث سے سماع موفیٰ ثابت ہوتا ہے

۱۔ کیا سماع موفیٰ کے قائل مشرک ہیں؟

میں نے سماع موفیٰ کے قائلین کو کسی جگہ بھی مشرک نہیں کہا۔ یہ مولانا محمد علی صاحب کا اپنا خیال ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماع موفیٰ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مستفسر شاہ فاروق ہاشمی صاحب نے پوچھا تھا کہ سماع موفیٰ کے قائلین کے حق میں آپ کیا فتوے دیتے ہیں؟ تو میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ ”میں کوئی فتویٰ دینے کے حق میں نہیں ہوں، البتہ آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اس سلسلہ میں تشدد نہ ہوں“ (حدیث رمضان ۱۴۰۴ھ ص ۳۱)

— رہی یہ بات کہ یہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ کیسے ہے؟ تو اگر تو بات صرف سماع موفیٰ تک محدود رہتی تو اس میں حرج بھی نہ تھا۔ مگر جب بات یوں بڑھے کہ مژدے علی الاطلاق سلتے ہیں اور ہر آنے والے کی ہر وقت سنتے ہیں۔ پھر صرف سنتے ہی نہیں، جواب بھی دیتے ہیں۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں۔ پھر صرف قبر پر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ سے سن سکتے ہیں۔ تو بتلاتے ہیں کہ شرک کسے کہتے ہیں؟ خدا بغیر اللہ اور کیا چیز ہے؟ جس کی قرآن پر زور تردید کرتا ہے جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ کے سوا جتنے بھی معبود ہیں سب باطل ہیں۔

۲۔ یہ بحث ذرا تفصیل سے آگے چل کر آئے گی۔

وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابل احتجاج نہیں ہوتیں۔ جو لوگوں کی چاپ سننے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میت کو احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز واقارب کی وجہ سے تو مارا پھرتا تھا وہ کچھ تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں، اس کے علاوہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ میری صبح کو لوٹا تاکہ، سحلی کہ میں اس سلام کا جواب دیتا ہوں جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے“ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں جیسا کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے، اگر زندہ ہوں تو روح کے لوٹائے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

قرآن مجید سماع کی پر زور تردید کرتا ہے۔ ضعیف، وضعی احادیث سماع موٹی کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ اماموں اور بزرگوں کی روایات سب خرافات ہیں۔ انہیں ماننا گویا قرآن و سنت سے دستبردار ہونا ہے۔

مولانا کیلانی صاحب نے اکابر مفسرین پر اعتماد کرنے کی بجائے من مانے نتائج اخذ کیے ہیں اور اگر اعتماد کیا ہے تو مولانا مودودی صاحب پر۔ گویا کیلانی صاحب نے جو تشریحات کی ہیں اور مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے قرآن و سنت کا انشاء بھی یہی ہے۔

مولانا مودودی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے دین کو ماضی حال کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن و سنت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے اور کرتے ہیں؟ (رد وادہم) کیلانی صاحب نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ ”اللہ کا شکر ہے کہ اہل حدیث نہ کسی امام کا مقلد ہے نہ علامہ کا، وہ ان بزرگوں سے استفادہ تو کر سکتا ہے مگر دشمنی برا و راست قرآن و سنت سے حاصل کرتا ہے۔“

الزام یہ نہیں کہ مولانا مودودی صاحب قرآن و سنت کو دین کا مافذ قبول سمجھتے تھے اور کیلانی صاحب قبول سمجھتے ہیں؛ بلکہ اعتراف یہ ہے کہ ماضی کے اشخاص اور

بزرگوں میں صحابہ کرام سے تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین و محدثین سب آجاتے ہیں۔ بقول علامہ ارشد القادری، (مصلحت زلزلہ) (یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی مشترک اور متوارث کوششوں سے دین اپنی واضح اور مفصل تشریحات کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن نہ مولانا مودودی صاحب کو ان بزرگوں کی فکر و دیانت پر اعتماد تھا اور نہ کیلانی صاحب کو ہے، یہ سب کی رائے ٹھکرا کر اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت ہی دین کا اصل ماخذ ہے، لیکن بحث الفاظ و عبارات میں نہیں، ان کے مفہوم و معانی میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مفہوم کے تعین میں فہم

۳۔ بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششیں؟

اب دیکھیے ان بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششوں سے ہی دین شیعہ حضرات کو بھی پہنچا ہے۔ بریلویوں، قادیانیوں، اہلحدیثوں کو بھی۔ غرضیکہ سب حضرات دین کی تفہیم کے بارے میں اپنے ڈانڈے انہی بزرگوں کے واسطے سے تابعین اور صحابہ تک پہنچاتے ہیں تو کیا یہ سارے کے سارے فرقے حق پر ہیں؟ آخر کون سی دلیل سے آپ اپنے علاوہ دوسروں کے بزرگوں کے فہم کو رد کر سکتے ہیں؟

۱۔ قرآن سماع موتی کی پرزور تردید کرتا ہے۔

۲۔ پھر قرآن ہی سے اللہ تعالیٰ کے، مردوں کو سنالنے کی استثنائی صورت بھی ثابت ہوتی ہے جس کی تائید بعض احادیث صحیحہ بھی کرتی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث یا تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث سماع موتی کا علی الاطلاق جواز ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ بعض بزرگوں کے اقوال صرف سماع موتی تو درکنار، ان مردوں کے جواب دینے اور حاجت روائی اور مشکل کشائی یا تصرف فی الامور کی بھی پرزور تائید کرتے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے صریح خلاف ہیں۔

پھر مجھے قطعاً یہ اصرار نہیں کہ دوسرے لوگ میرے فہم کو قابل اعتماد سمجھیں بلکہ ان کے لیے بھی یہی راہ صواب ہے کہ وہ ہر بات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے کے بعد ہی کسی بات کو درست یا نادرست قرار دیں۔

ہی کو دخل ہے۔ اور جب اکابر امت کا فہم مولانا مودودی صاحب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں تھا اور جناب کیلانی صاحب کے نزدیک نہیں ہے تو خود ان کے فہم پر کوئی کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟

قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی آئی ہے،
 ”اس امت کے پچھلے اگول پر لعن طعن کریں گے“ (ترمذی جلد دوم)

۵۔ پچھلوں کا پہلو پر لعن طعن۔

لعن طعن کرنا اور بات ہے۔ ان کی عزت و تعظیم کرنا اور بات، اور ان کے اقوال و ارشادات کو قابل اتباع اور حجت سمجھنا اور بات ہے۔ لعن طعن کرنے والے تو شیعہ حضرات ہیں جو علی الاعلان صحابہ کرام پر تبرا بولتے ہیں۔ یا پھر خارجی، ناموسی، رافضی وغیرہ ہیں۔ جو علی الاعلان لعن طعن نہ بھی کریں، تاہم ان کے منہ سے ان بزرگوں کے حق میں کلمہ خیر کم ہی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی بزرگوں پر لعن طعن نہیں کرتا۔ صحابہ کرام اور تابعین تو درکنار، ہم تو ائمہ کرام کو کھلی تعظیم اور ان کی کوششوں کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک کی ہر اک بات کو ہم من و عن تسلیم کر لیں جبکہ ہمارے پاس ایک معیار موجود ہے کہ دین کی ہر ایک بات کو کتاب و سنت پر پیش کیا جانا چاہیے۔ اب اگر کسی بزرگ کی بات اس معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے ناقابل قبول سمجھی جائے تو اس سے لعن طعن کا کوئی پہلو نکلتا ہے؟ اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھاؤں گا۔

امام نسائی نے اپنی سنن (کتاب الحج) میں مروان بن حکم سے روایت کی، کہ میں حضرت عثمانؓ کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے حضرت علیؓ کو عمرہ اور حج دونوں (یعنی حج قرآن) کی لبیک کہتے ہوئے سنا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو اس سے منع فرمایا اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ:

”فَكَفَّ أَدْعَاؤَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ“

(نسائی، کتاب الحج، باب القرآن)

”میں تمہارے قول کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ”بڑی جماعت کی پیروی کرو“ یعنی جس طرف

قول کو نہیں چھوڑ سکتا۔

غور فرمائیے۔ حضرت عثمانؓ اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ کو حکماً اس بات سے منع کرتے ہیں۔ (جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کو پہلے اس کا علم نہ تھا) لیکن حضرت علیؓ نے آپؐ کے قول کی کوئی پروا دینی کی تو پھر دوسرے ائمہ کرام یا بزرگان دین محس شمار و قطار میں ہیں؟

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد محترم سے حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ ”میں تو آپؐ کو رسول اللہ کا قول سنا تاہم اور آپؐ اپنی بات کرتے ہیں“ غرضیکہ ایسی مثالیں دورِ صحابہؓ میں کافی مل جاتی ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا حضرت عمرؓ کو یہ جواب لعن طعن کیسے کہلا سکتا ہے؟

ائمہ و مشائخ کے اقوال کو حجت سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔

اب ان ائمہ کرام اور بزرگان دین کی مشترک اور متواتر کوششوں کا دوسرا پہلو بھی سامنے لائیے۔ ان حضرات کی ہر بات کو قابل اتباع سمجھنے کا دوسرا نام تقلیدِ آباء یا آباء پرستی ہے۔ جسے قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر مردود و قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے یہی ائمہ کرام اور بزرگان دین تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِن تَخَذُوا آخْبَارَهُمْ وَرُءُوبَانَهُمْ أَزَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ“

”انہوں نے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنالیا تھا“

اس آیت سے متعلق جب عدنی بن حاتم۔ جو پہلے عیسائی تھے۔ نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! ہم اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں سمجھتے تھے“ تو رسول اللہؐ نے جواب دیا۔ ”کیا تم ان کے بتلائے ہوئے حلال کو حلال، اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟“ عدنی بن حاتم نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات تو تھی“ تو آپؐ نے فرمایا، ”رب بنالے کا یہی مطلب ہے“ (ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

اکثر علماء ہوں!۔ جبکہ کیلائی صاحبہ پھلوں کی تحریروں کو مردود و ٹھہرا کر صحیح

گویا یہود و نصاریٰ کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ بزرگانِ دین اور ائمہ کرام شریعت کو ہم سے بہتر سمجھتے اور ہم سے بہت زیادہ نیک اور متقی تھے لہذا وہ دین کی باتوں کو شریعت کے اصل ماخذ پر پیش کرنے کی بجائے انہی بزرگوں اور ائمہ کرام کے اقوال و اشادات کو قابلِ اتباع سمجھ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ دین ہمیں انہی بزرگانِ دین کی مشترک اور متواتر کوششوں سے پہنچا ہے۔

فرقہ پرستی کی اصل بنیاد۔

اور تیسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ دین میں جب کبھی بھی بگاڑ پیدا ہوا ہے تو انہی ائمہ کرام اور مشائخِ عظام کے اقوال و ارشادات کو حجت اور واجبِ اتباع سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یہی بات فرقہ پرستی کی بنیاد بنتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

وَهَذَا أَفْسَدَ الدِّينَ إِلَّا الْمَلُوكُ وَأَخْبَارُ سُوءٍ وَرُفْهَانُهَا

یعنی ”دین کو تباہ و برباد کر لے والے تین ہی گروہ ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ،

علماءِ سوء اور بزرگانِ دین“

اسی لیے امامِ مالکؒ رسولِ اللہؐ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ نے تھے: ”صرف یہی وہ ہستی ہے جس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ باقی سب دوسرے لوگ، تو ان کی باتوں کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی۔“

اور امام بخاریؒ نے تو ”کتاب الاعتصام بالسنة“ میں ایک مستقل باب باندھ لیا ہے جس کا عنوان ہے،

”آنحضرتؐ کے سامنے ایک بات کی جائے اور آپؐ اس پر انکار

نہ کریں تو یہ حجت ہے۔ آپؐ کے سوا کسی اور کی تقریر حجت نہیں“

۱۵۔ بڑی جماعت یا سوادِ اعظم کا مفہوم؟

”بڑی جماعت یا سوادِ اعظم سے موصوف نے ”اکثر علماء“ مراد لی ہے۔ اگر ان کا یہ مفہوم درست سمجھا جائے تو یہ بات بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

تشریحات کو اپنی اور اپنے چند ہم خیالوں کی تحریروں میں مقتید سمجھے ہوئے ہیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَنْ كَثِيرًا مِّنَ الْأَخْبَارِ وَالرَّهْبَانِ
لِيَأْكُلُوا أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيُصْغِرُوا عَنْ سَبِيلِ
اللَّهِ“ (التوبة: ۳۴)

”اے ایمان والو! علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو ناحق لوگوں
کے مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں“

گویا علماء و مشائخ کی اکثریت خدائی احکام کی غلط تعبیر پیش کر کے ایک تو لوگوں
سے پیسے بٹورتی ہے اور دوسرے شریعت کی راہ میں روک بن جاتی ہے۔ اور رہبان
یعنی مشائخ عظام یا بزرگان دین کے متعلق بھی بالوضاحت فرمایا کہ،
”وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ“ (المحمدیہ: ۲۷)

”ان میں سے اکثر فاسق ہوتے ہیں“

ان آیات کی روشنی میں محض علماء کی اکثریت کو کیسے واجب الاتباع قرار دیا جا
سکتا ہے؟

بڑی جماعت سے حقیقتاً وہ جماعت مراد ہے جو نظام خلافت قائم کرتی یا رکھتی ہے۔ آپ کے
ایسے ارشادات کا تعلق سیاسی امور سے ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا:-

لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ، وَلَا
جَمَاعَةَ إِلَّا بِالْإِمَامِ، وَلَا إِمَامَ
إِلَّا بِاتِّمَاعِهِ وَالطَّاعَةِ۔
اسلام جماعت کا متقاضی ہے اور جماعت
امیر کی اور امیر کی امارت تب ہی مستحکم ہو سکتی ہے
کہ اس کی بات سنی اور اس کی اطاعت کی جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت درج ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے:-

”حضرت عرفجہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر تمہارے معاملات
کسی ایک شخص پر مجتمع ہوں۔ پھر کوئی دوسرا شخص تمہاری قوت کو ٹوٹے یا تفرقہ ڈالے تو اسے
قتل کر دو۔“ (مسلم - کتاب الامارہ والقضاء)۔

”حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت نکلا اور
جماعت الگ ہو اور پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“ (مسلم - حوالہ ایضاً)۔

آخر ایسا مسئلہ جس پر اکابر علماء امت کا اجتماع ہو چکا ہوگی مخالفت کرنا کوئی دینی خدمت ہے؟ جبکہ سماع موتی کے باب میں اکابر علماء نے بھی قرآن و سنت ہی سے استدلال کیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:
 ”بالجملہ کتاب و سنت مملوہ مشحون اند کہ دلالت می کند بر وجود علم موتی را بدینا دامل دنیا پس منکر نشود آل را جاہل باخبار و منکر دین“
 (اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۱۱۸)

ترجمہ: ”مختصر یہ کہ کتاب و سنت ایسے دلائل سے بھر پور ہیں جو اموات میں دنیا و اہل دنیا کے علم و معرفت اور احساس و شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا سماع اموات کا منکر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اخبار و روایات سے بے خبر ہو یا پھر ضروریات دین کا منکر!“

کھ سماع موتی پر اجماع اُٹھتا ہے؟

سماع موتی کے مسئلہ پر اجماع تو صحابہ میں بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تو پھر آپ کون سے اکابر علماء امت کے اجماع کی بات کرتے ہیں؟ علاوہ ازیں ہم پہلے مرعۃ شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۰۵ کے حوالہ سے بتلا چکے ہیں کہ صرف ایک عبدالمشرب عمرؓ سماع موتی کو درست سمجھ کر رسول اللہؐ کی قبر مبارک پر آکر سلام کرتے تھے۔ دوسرے کسی صحابی سے یہ عمل ثابت نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور پیرانِ پیر کی تہا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی وہ محدث ہیں جنہوں نے سماع موتی کو بنیاد بنا کر ”صلوٰۃ غوثیہ“ پاپیر پر پیر کی نماز ”نک کو جائز اور درست تسلیم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں، ”آپ (سید عبد القادر جیلانی) نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکارِ پر درو بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حاجت بری کرے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے)۔“ (اخبار الاخیار مصلفہ عبدالحق محدث

حضرت سراج المند مولانا شاہ عبد الغفرین ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”بالجملة انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بولدن اوشبہ نیست“
 ترجمہ: ”مختصر یہ کہ اگر اموات کے احساس و شعور کا انکار کفر نہ ہو، مگر منکر کے الحاد و بے دینی میں شبہ نہیں ہے۔“

دہلوی مترجم اردو سبحان محمود ص ۱۴۹، ۱۵۰، نیز دیکھیے، سیرۃ نفوس الثقلین مصنفہ ضیاء اللہ قادری ص ۲۴۲

غور فرمائیے، محدث صاحب کے اس پورے بیان میں صرف آخری ایک عبارت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلا شک و شبہ تحقیق شدہ ہے۔ اور یہ بات ہے بھی قرین قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو، وہاں صرف گیارہ قدم جانب عراق (بغداد جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی جگہ (رض) تلاش کرنے سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ (الفاتحہ: ۴)

”(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔“

اور دوسری طرف عبد الحق محدث صاحب کا یہ تحقیق شدہ بیان ہے۔ ان میں مناسبت و موافقت آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔ محدث صاحب نے جن بلند پایہ مراجع سے تحقیق فرمائی ہے، وہ یہ ہیں:

بہجت الاسراء قللاً مد الجواہر، زبدۃ الآثار، نزہۃ الخاطر، اللغات اور تفریح الخاطر۔

دیکھئے ان میں کوئی بھی حدیث کی کتاب ہے؟ — یہ ہے، اکثر علماء کے اقوال

کو واجباً للاتباع سمجھنے کا نتیجہ!

۱۴ اموات کا احساس و شعور۔

اموات کے احساس و شعور سے کسے انکار ہے؟ اگر ان میں احساس و شعور نہ ہو

تو قبر کا عذاب کیسے ہو سکتا ہے اور اموات جنت کے فوائد سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس احساس و شعور سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اہل دنیا کی باتیں بھی سن سکتے ہیں؟

مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب کے قرآن مجید سے انکارِ سماع سے

متعلق دلائل اور ان کا تجزیہ

دلیل نمبر ۱: والذین یدعون ترجمہ - ”اور جنہیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان۔“

کیلانی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اموات غیر احیاء کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

کیلانی صاحب کا اندکروہ یہ نتیجہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔ فوت شدہ بزرگوں میں انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، صالحین بھی داخل ہیں۔ انبیاء کرام کی حیات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واستل من ارسلنا من قبلك من رسلنا اجعلنا من دون الرحمن یعبدون۔

ترجمہ - وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے پوچھ

عہ من ذؤن الرحمن الیہ . . . (ادارہ)

اسی عالم دنیا میں ایک سو یا ہوا شخص اس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا، تو دوسرے عالم یعنی عالم برزخ میں پہنچا ہوا شخص اس عالم دنیا کی باتیں کیونکر سن سکتا ہے؟ بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سو یا ہوا شخص احساس و شعور رکھتا ہے۔ اور اسی احساس و شعور کی وجہ سے خواب میں چلتا پھرتا، باتیں کرتا اور سنتا ہے۔

۱۲ قرآنی دلیل کا جواب

یہاں لفظ ”واستل“ کا ترجمہ بعض مترجمین نے ”پوچھو“ کے بجائے

”احوال دریافت کرو“ بھی کیا ہے (مثلاً فتح العمد ترجمہ فتح محمد خالد حری) تاہم حاشیہ میں اکثر مفسرین نے وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد ان رسولوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہے مثلاً،

یعنی کہ ہم نے ذاتِ رحمنِ جلّ وعلیٰ کے بغیر کئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے یقیناً ایسا نہیں۔

- ۱- ترجمہ شاہ رفیع الدین حاشیہ موضع القرآن (شاہ عبدالعزیز) میں یعنی ان رسولوں پر جو کتابیں اتری تھیں ان کو دیکھ لے یا ان کی امت کے لوگوں سے پوچھ لے ؟
- ۲- موضع القرآن از وحید الزمان نے بھی حاشیہ پر بالکل یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔
- ۳- تفہیم القرآن: منہج رسولوں سے پوچھنے کا مطلب ان کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح ”وَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ الْوَسْطَى“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات انہیں سکھا دی کہ اللہ جلّ شانہ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے ؟

۴- ترجمہ رضا خاں بریلوی (کنز الایمان) اور حاشیہ نعیم الدین مراد آبادی جگہ رسولوں سے سوال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اُدیان وطل کی تلاش کرو۔ کہیں بھی کسی نبی کی امت میں بُت پرستی روارکھی گئی ہے ؟ اور اکثر مفسرین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ مومنین اہل کتاب سے دریافت کرو۔ کیا کسی نبی نے غیر اللہ کی عبادت کی اجازت دی ؟ تاکہ مشرکین پر ثابت ہو جائے کہ مخلوق پرستی نہ کسی رسول نے بتائی نہ کسی کتاب میں آئی۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ شبِ معراج سید عالم نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ جب حضور نماز سے فارغ ہوئے جبریل نے عرض کیا کہ اے سرورِ اکرمؐ، اپنے سے پہلے انبیاءؑ سے دریافت فرما لیجئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی اور کی عبادت کی اجازت دی ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سوال کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی اس میں کوئی شک ہی

اگر انبیاء کرام میں حیا نہ ہوتی، وہ خطاب و مذاکرہ نہ سمجھتے ہوتے اور جواب

نہیں کہ تمام انبیاء توحید کی دعوت دیتے آئے۔ سب نے مخلوق پرستی کی ممانعت فرمائی۔“

اب دیکھیے ہم نے چار مختلف مکاتب فکر کے مفسرین کے حواشی پڑھ کر لیے ہیں۔ اور چاروں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ یہاں ”وَاشْتَقَلَّ“ سے مراد ان کی کتابوں سے یا مومنین اہل کتاب سے معلوم کرنا ہے۔ نہ کہ گوشہ نشین رسولوں سے دریافت فرمانا۔ اور پانچویں فتح محمد جالندھری بھی ہیں۔ جنہوں نے ترجمہ میں ہی مسئلہ حل کر دیا۔ البتہ کنز الایمان کے مفسر نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے ایک روایت بھی درج فرمائی۔ اور یہی روایت جناب محمد علی صاحب مضمون کو بھی پسند آئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مضمون میں یہ روایت تفسیر کھیرچ، ص ۴۳۰ کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ لیکن یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ سورۃ زخرف کی یہ آیت واقعہ معراج سے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل، جس میں مسجد اقصیٰ کے واقعہ کا ذکر ہے، کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۵۰ ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۶۳ ہے۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے دو سال قبل کا ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف اس وقت نازل ہوئی جبکہ کفار آپ کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۸۰، ۷۹ سے واضح ہے۔ لہذا قبل از نزول آیت مذکورہ، جبریل کا حضورؐ سے یہ کہنا کہ ”ان رسولوں سے پوچھ لیجئے اللہ پوری آیت پڑھ جانا۔ یہ کیسے ممکن ہے!“ وضعی روایت اور سماع موتی۔

پھر اگر اس روایت کو درست بھی تصور کر لیا جائے تو بھی اس پر درج ذیل اشکال وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ مسجد اقصیٰ میں سوا لاکھ پیغمبروں کے (برزخی زندگی میں) جمع ہونے کے علاوہ اس سے قبل، تمام بنی نوع انسان کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت بھی

کی قدرت ان میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل سے دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔

کنز العمال میں حدیث ہے۔ من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی من بعید علمته۔ (البوشیخ عن ابی ہریرۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کے پاس درود پڑھا میں خود ستا ہوں اور جس شخص نے مجھ پر دُور سے درود پڑھا میں اس کو جانتا ہوں۔

حدیث ۲: عن ابی ہریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حاضر کیا تھا جب ان سے عہد "السنۃ" لیا تھا۔ اور اس دور کو خدا تعالیٰ

نے موت کا دور کہا ہے تو پھر تو سماعِ موتی کے قاتلین کو اس معراجِ ولے

سوال جواب کے بجائے اس واقعہ سے ثبوت پیش کرنے کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ

اس موت کے دور میں روحوں نے صرف سنا ہی نہیں تھا بلکہ جواب بھی دیا تھا۔

۲۔ جبریلؑ نے حضور اکرمؐ سے کہا بھی کہ انبیاء حاضر ہیں۔ ان سے سوال

کیجئے۔ لیکن آپؐ نے پھر بھی سوال نہیں کیا تو اس آیت پر عمل کیا ہوا؟

۳۔ پھر جب آپؐ نے سوال ہی نہیں کیا، نہ ہی انبیاءؑ کی ارواح نے مجھ جواب

دیا تو سماعِ موتی ثابت کیسے ہوا؟ اور اس روایت سے آپؐ کا استدلال درست کیونکر؟

ان تصریحات سے البتہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "وَأَسْئَلُ" کا حکم

وجوب کے لیے نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ یعنی اگر آپؐ چاہیں تو سابقہ انبیاءؑ کی

کتاب یا ان یہود و نصاریٰ کے مؤمنین یا بمصدق روایت بالانبیاءؑ کی ارواح سے

پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپؐ کو یقین تھا کہ ایسی بات کا کسی الہامی کتاب میں

لکھا ہونا ناممکن ہے۔ لہذا آپؐ نے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھا اور نہ ہی سماعِ موتی

کے استنباط کی گنجائش باقی رہی۔

۱۱۔ دوسری وضعی روایت۔

اس موضوع حدیث پر پہلے ص ۵۳ پر بحث گزر چکی ہے۔

ہا من احد یسلم علی الا علی روحی ارد علیہ رواہ الطبرانی فی الاوسط
 "رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھے مگر اللہ تعالیٰ
 مجھ پر روح کو لوٹا لے تاکہ میں اس کا جواب دوں" اور کوئی وقت ایسا نہیں
 جب آپ پر درود و سلام نہ پڑھا جائے۔ آپ ہر وقت صلوٰۃ و سلام کا جواب
 روح بمعہ جسم ہی عطا فرماتے ہیں۔

اب کیلانی صاحب ہی بتائیں کہ ان بزرگ ہستیوں انبیاء کرام کو ایک مسلمان
 کیسے بے جان لاشیں تصور کرے۔ شہداء سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ولا تقولوا
 لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احياء وکن لا تشعرون۔
 جو لوگ اللہ تبارک تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے انہیں مردہ نہ کہو بلکہ
 وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ اس آیت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے
 بزرگوں کی لاشیں بے جان نہیں تھیں کیلانی صاحب حقیقت ہی ہے کہ سورۃ نحل کی

عہ چوہدری صاحب نے اپنے مضمون میں عربی عبارات کج فط لکھی ہیں۔ پھر اعراب کے بغیر
 بھی ہیں جبکہ اردو عبارت میں اکثر نیچریشن کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ادارہ محدث اگرچہ اعراب
 مصحت لفظی وغیرہ کا خصوصی التزام کرتا ہے لیکن ہم نے چوہدری صاحب کی عبارات کو نہ
 درست کیا ہے نہ ان پر اعراب وغیرہ لگائے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کا مضمون من و عن
 شائع ہو ورنہ قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس حدیث کی عبارت کو انہوں نے مضحکہ خیز رنگ
 بگاڑ دیا ہے۔ حالانکہ کیلانی صاحب کے حسن مضمون پر وہ تعاقب کر رہے ہیں، اسی مضمون سے اس کی
 صحیح عبارت نقل کی جاسکتی تھی، جو یوں ہے: "مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللَّهُ عَلَيَّ
 رُوحِي حَتَّىٰ أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ" (محدث جلد ۱۲ عدد ۲۰ ص ۲۴)

یہ وضاحت اس لیے کر دی ہے کہ قارئین کرام مدد مصحت عبارت کو ادارہ کا تامل سمجھیں۔ (ادارہ)

۳۰ تیسری وضعی روایت۔

طبرانی کی اس حدیث پر بھی ص ۵۲ پر بحث گزر چکی ہے۔

۱۳ شہداء کی زندگی ہمارے جیسی نہیں۔ اگر ہمارے جیسی موتی تو ہم
 سے ضرور سمجھ سکتے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قبروں میں پڑے ہوئے بزرگ زندہ ہیں
 ہماری بات سنتے، جواب دیتے اور ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں تو ایسی زندگی کو ہم
 سمجھ سکتے ہیں اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف، نیز دیکھئے ص ۱۱۰ اور کتاب اہل

یہ آیت مبارکہ کفار کے معبودانِ باطل توں وغیرہ کے حق میں نازل شدہ ہے۔
 دلیل ۲۔ ترجمہ۔ زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا
 سکتا ہے لیکن (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں
 میں مدفون ہیں۔ فاطر ۲۲

اس آیت سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس آیت کا حاصل
 یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اللہ سنا
 سکتا ہے۔

دلیل نمبر ۳۔ ترجمہ۔ اور اس شخص سے رُحِ عکرم کون گمراہ ہو گا جو ایسے
 کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے بلکہ ان کو ان لوگوں کے
 پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ مدوز قیامت اکٹھے کیے جائیں گے۔
 تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی
 پرستش سے انکار کر دیں گے (الاحقاف ۶۵)

کیلا فی صاحب کی تشریح۔ آیت نمبر میں وَهُنَّ عَنْ دُعَائِهِمْ
 غُفْلُونَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے
 ہیں کیونکہ وہ دعائیں سن سکتے ہیں اور کَاثُوا لَهْفًا اَعْدَاءُ کے الفاظ بتوں
 اور مظاہر قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں ... اب
 صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جو اس آیت کا صحیح مصداق بن
 سکتے ہیں۔

مولانا کیلا فی صاحب کا یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ بزرگوں کے لئے
 ساتھ بغض و عناد سے محفوظ رکھے۔

۱۲۔ بزرگوں سے بغض و عناد؟۔ بزرگوں سے بغض و عناد سے مراد اگر فوت شدہ
 بزرگوں کو زندہ تسلیم نہ کرنا، اور تصرف فی الامور یا الوہبیت میں انہیں خدا کا شریک و ہم
 سمیت سمجھنا ہے تو ہم واقعی اپنے اس "جہم" کا اقرار کرتے ہیں۔ تاہم ایک بات پوچھنے کا حق ضرور
 رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آخر خود رسول اللہؐ کو ان بزرگوں سے کیا بغض و عناد تھا، جن کے
 مقبرے، مدفن اور مزارات کو آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر حکم مسمار کر دیا تھا، کیا ان
 کی وجہ یہی نہ تھی کہ وہ لوگ ایسے ہی عقائد میں مبتلا تھے؟

مولانا موصوف کے اس استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے واضح کیا جائے گا۔
پہلے اس بارے میں اقوالِ مفسرین پیش کیے جائیں گے۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں ای لا اصل ممن يدعو من دون
الله اصناما و يطلب منها ما لا تستطيع الی يوم
القيامة و هي خافلة عما يقولون لا تسمع ولا تبصر
ولا تبطلش لا نهاجا و حجارة صم۔ جلد ۴ ص ۱۵۹

ترجمہ۔ یعنی کوئی اس شخص سے زیادہ گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ بتوں کی
عبادت کرتا ہے اور ان سے ایسے امور کی استدعا کرتا ہے جن کی قیامت تک
ان میں انتطاعت و قدرت نہیں اور وہ ان کے اقوال سے غافل ہیں، نہ سنتے
اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی پکڑ سکتے ہیں کیونکہ وہ بے جان پتھر ہیں اور قوتِ سماعتِ عاری
۲ تفسیر فائز میں ہے من لا يستجيب یعنی الاصنام لا تجيب مابديها
الی شئ یشلونہا۔

ترجمہ۔ من لا يستجيب سے مراد بت ہیں جو اپنے عابدوں کو وہ اشیا
میں نہیں کر دیتے جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں بھی اسی سے ملتی جلتی
تفسیر ہے۔

۳ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ میں سے (الی يوم القيامة) و
انما جعل ذلك غاية لان يوم القيامة قد قيل انہ تعالیٰ یحییہا
وتقع بیدہما و بین من یعبدا ما مخاطبة فلذلك جعله
حدا و اذا قامت القيامة وحشر الناس فہذہ الاصنام
تعا دمی ہو لاء العابدین و تتبرع منہم۔ جلد ۲، ص ۴۷

ترجمہ۔ مجبوراً ان باطلہ کے جواب نہ دینے کی حد یومِ القیامت مقرر فرمائی (جس سے
لازم آئے گا کہ قیامت کے دن وہ ان کو جواب دیں گے۔ حالانکہ بت تو قیامت
کے دن بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی نے
فرمایا) کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو زندگی بخشے گا اور ان کے درمیان
اور مشرکین کے درمیان گفتگو ہوگی۔ لہذا جواب نہ دینے کی حد قیامت کا دن بنادیا
اور جب قیامت قائم ہوگی، تمام لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، تو یہ بت

اپنے حامیوں کے دشمن بن جائیں گے، ان سے اور ان کی عبادت سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اس کے علاوہ دیگر کتب تفاسیر میں بھی اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے

اور من لا یتستجیب لہ الی یوم القیامت وہم عن دعاہم غفلون
 کے مصداق اصنام و اوثان کو بنایا گیا ہے۔

کیلانی صاحب کے استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے

حضرت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ انکم وما تعبدون من دون
 اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون۔

ترجمہ۔ بے شک تم خود اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو، سب کے سب جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے اور بقول کیلانی صاحب یہ عبادت بزرگوں کی ہے جس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام سبھی شامل ہیں تو ان کا

حال من دون اللہ سے مراد؟ چودھری صاحب بعض سماع کے قائل مفسرین کے حوالہ سے

ثابت فرماتے ہیں کہ من دون اللہ سے مراد صرف بت میں حالانکہ قرآن و حدیث میں بت کے آئینہ

دون اللہ کو دین مثلاً شمس و یسری (ستارہ) اصنام، اوثان، طاغوت، جتن، ملائکہ، انبیاء

اور اولیاء۔ آیت بالا میں وَاذْخُرِ النَّاسَ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں

من دون اللہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے جنہیں بکرا جاتا تھا نہ کہ پتھر کے اصنام کی۔ ہمارا اس بات

پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن پتھروں کے اصنام کو اکٹھا کر سکتا اور انہیں قوت گویائی بخش سکتا

ہے مگر جب اس آیت میں ایسا کوئی قرینہ ہی نہیں تو محض قدرت الہی کا ہمارے کریں من دون

اللہ صرف اصنام مراد لینے کی کیا گت ہے۔ سماع کے قائل حضرات دراصل انبیاء و اولیاء کو عن

دعائہم غفلون سے غفلت قرار دینا چاہتے ہیں مگر کتاب و سنت اس سے ابا کرتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ

مجھے اور میری ماں کو من دون اللہ کہہ بنا نا؟ اس سوال کا جواب کا آخری حصہ عیسیٰ کا یہ جواب ہے

کہ جب تک میں ان میں تھا۔ انکے حالات سے باخبر رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو ان کا

گم ہونا تو ہے (۵) اب اگر عیسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر جنہیں موت آئی ہی نہیں اور بچہ غصری آسمان

پر زندہ ہیں عن دعائہم غفلون کا خود اقرار کر رہے ہیں تو دوسروں کے لیے یہ بات کیسے تسلیم کی جاسکتی

جہنم میں داخل ہونا اور نار دوزخ کا ایندھن بننا لازم۔ نعوذ باللہ منہ۔ جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبوب مستیوں سے متعلق فرماتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا هم یحزنون۔

ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ اولئک عنہا مبعدون لا یسمعون حسیہا وہم فیما اشتهت انفسہم خالدون لا یحزنہم الفزع الاکبر و تتلقاہم لملائکہ ہذاہ یومکم الذی کنتم توعدون۔ ترجمہ۔ تحقیق وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے۔ وہ نار جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ نار جہنم کی آواز ذرہ بھر بھی نہ سنیں گے اور اپنی پسندیدہ نعمتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے انہیں سب سے بڑی گھبراہٹ (دہشت قیامت وغیرہ) غم میں نہیں ڈالیں گے اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ ہے وہ دن جیسا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ تفسیر البوسعد میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ "انکم وما تعبدون من دون اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون لو کان ہو لاء الہیۃ ماوردوہا وکل فیہا خلدون۔

لے مشرکین تم اور تمہارے معبودان باطلہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم سب اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر تمہارے معبود درحقیقت الہ ہوتے تو دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوتے۔ اور یہ سب ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، کو مشرکین پر تلاوت کیا تو ابن زبیرؓ نے کہا کہ ہمارے بت اور اصنام اگر جہنم میں داخل ہوں گے، تو عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی عبادت کرتے ہیں

عہ آتش: قرآن مجید کی آیات تک غلط لکھ دی ہیں۔ صحیح الفاظ یہ ہیں، وَتَتَلَقَّہُمُ الْمَلَائِکَةُ

اور یہودی حضرت عزیرؑ کی پرستش کرتے نہیں اور نبی یلع ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں۔ لہذا وہ بھی جہنم میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان بد باطنوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ یا دوسرے اولیاء اور شہداء اور صلحاء کے لیے ہماری طرف سے وعدہ خیر اور پیمان جود و عطا ہو چکا ہے۔ لہذا ان کا یہ انجام نہیں۔ یہ صرف تمہارے معبودات باطلہ اور ارباب من و دن اللہ کا انجام بنا اور عاقبت قلیمہ ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ اصنام و انصاب اور صور و تماثل کے حق میں وارد آیات کا انبیاء کرام رسل عظام اور اولیاء شہداء اور صالحین پر چسپاں کرنا محض جہالت اور قرآن و سنت کی قلیح ترین تحریف ہے بلکہ قرآن مجید فرقان حمید کی بہت سے آیات سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے۔

۱۰ معبودان باطل اور بزرگ ہستیاں۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی نبی، رسول، شہید اور صالح کی عبادت کی ہے تو اس آیت ”اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبٌ جَمَلٌ“ کے بموجب یہ بزرگ ہستیاں معبودان باطل کی مغفوت سے مستثنیٰ ہی رہیں گی۔ البتہ ان کو پوجنے والے ضرور جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم، لیکن اس سے سماع موتی کیسے ثابت ہو گیا؟ یہ عقدہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ شاید اس پر موصوف کچھ روشنی ڈال سکیں۔ اس سے تو الٹا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سماع موتی کو درست سمجھ کر انہیں پجارتے رہے یا عبادت کرتے رہے ہیں ان کو ان کے اس جرم کی سزا یہ ملے گی کہ وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہی یہ بزرگ ہستیاں تو چونکہ ان کا اپنا کوئی قصور نہیں، لہذا انہیں دوزخ سے دور رکھا جائے گا اور جو بتوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو وہ بھی محض مشرکین کے اس زعم باطل کی تردید اور مزید حسرت و ايس کے احساس دلانے کے لیے ہو گا۔ ورنہ پتھر کے بتوں کا اپنا کیا قصور ہو سکتا ہے اور جہنم میں داخل کرنے سے انہیں کیا نقصان پہنچے گا؟

جناب محمد علی صاحب لکھتے ہیں:

”بلکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے“

ثبوت نمبر۔ قال اللہ تعالیٰ واسئل من ارسلنا من قبلك
من رسلنا اجعلنا من دون الرحمن الہمة یعبدون۔

ترجمہ۔ وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے
پوچھ لیجئے کیا ہم نے ذات رحمن جل و علیٰ کے بغیر کئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی
عبادت کی جائے یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اگر انبیاء کرام میں حیات نہ ہوتی وہ خطاب و ندا کو نہ سمجھتے تو حق تعالیٰ اپنے
محبوب کو دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔ تفسیر کبیر جلد سابع ص ۲۳ پر ہے "عبداللہ
ابن عباس سے مروی ہے کہ جب شب اسراء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد
میں سے تمام رسولوں کو آپ کے لیے مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا۔ حضرت جبرائیل
علیہ السلام نے اذان دی اور اقامت کی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت جبرائیل
نے عرض کیا ان رسولوں سے جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے سے دریافت
کر لیجئے (جیسا کی آیت میں ہے) آپ نے فرمایا لا اسئال لانی لست
نشا کا فیہ۔ میں نہیں پوچھتا مجھے کوئی شک نہیں۔

ثبوت نمبر۔ قال اللہ تعالیٰ۔ وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا
ان کنت من المرسلین فاخذ ترہم الرجفۃ فاصبحوا فی
دارہم جثمین فتولیٰ عنہم وقال یقوم لقد ابلغتکم رسالۃ
ربی ونصحت لکم ولكن لا تحبون الناصحین۔

اب درج بالا آیت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کی تو ہم نے وضاحت
کر دی ہے۔ باقی جو آیات درج فرما کر آپ نے ثبوت پیش کیے ہیں وہ "واسئل"
کے الفاظ سے شروع ہونے والی آیت کے علاوہ صرف ایک مزید آیت ہے
جو ۱۹ کے تحت زیر بحث آرہی ہے۔
۱۰ اس آیت پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

ترجمہ۔ (قوم صالح علیہ السلام نے ان سے کہا) اے صالح جس عذاب کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے وہ ہمارے پاس ہے آ، اگر تو درحقیقت مرسلین میں سے ہے۔ تو زلزلہ نے انہیں اپنے گھر سے میں لے لیا۔ پس وہ لوگ اپنے گھروں میں تباہی و بربادی سے دوچار ہو گئے اور علیحدہ ہوتے وقت ان سے مخاطب ہو کر کہا اے میری قوم میں نے تمہیں رب کے پیغام پہنچائے اور نصیحت کی، لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

امام رازی نے تفسیر میں فرمایا۔ ”پہلا قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی علیحدگی ان کی ہلاکت کے بعد پائی گئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ فاتعیب اور فوری ترتیب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اعراض ہلاکت کے بعد متحقق ہوا اور انہوں نے قوم کی ہلاکت کے بعد انہیں خطاب فرمایا جیسا ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مقتول کو خطاب فرمایا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ ان مردوں کے ساتھ کلام فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں لیکن وہ لوگ ایسے جواب پر قادر نہیں ہو تم سن سکو۔ جلد رابع ۲۵۵ قال ابو السعود خا طہم علیہ الصلوۃ والسلام بذلک خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اهل قلب بد رحیث قال انا وجدنا ما وعدنا ربنا نهل وجدتم ما وعد کمد بکم حقاً۔ جلد رابع ۲۶۰ علامہ ابو السعود فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی ہلاکت شدہ قوم کو ایسے

ہلہ نہ ہمیں قلب بدر کے واقعہ سے انکار ہے نہ ان مختصرین کی تفسیر سے۔ یہ سب صورتیں سجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور تشکیکی صورتیں ہیں۔ لہذا ان واقعات سے علی الاطلاق سماع معنی ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس بات سے آخر کے انکار ہے کہ اللہ جب چاہے مردوں کو سنا سکتا ہے۔ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ آیا ہم لوگ بھی مردوں کو سنا سکتے ہیں؟ یا عام حالات میں وہ ہماری بات بھی سن سکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ واقعات ایسا ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ بلکہ الثا قرآنی نصوص اس کا رد ضرور ثابت کرتی ہیں۔

ہی خطاب فرمایا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کنوئیں میں پھینکے ہوئے کفار سے خطاب فرمایا۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد خطاب فرمایا۔
ثُبُوتٌ مُّكَلَّبٌ - وَالنَّازِعَاتُ غُرُقًا وَالشَّاعِلَاتُ نَشَطًا وَالسَّابِحَاتُ سَبْحًا فَالسَّابِقَاتُ سَبِقًا فَالْمُدْبِرَاتُ أُمُورًا۔

قسم ہے ان نفوس قدسیہ کی سختی سے جان کھینچیں اور زمی سے بند کھولیں اور آسانی سے تیریں پھر آگے بڑھ کر جلد پہنچیں، پھر کام کی تدبیر کریں۔
مفسرین کرام نے صفات مذکورہ کو ملائکہ کے علاوہ نفوس کاملہ اور ارواح فاضلہ پر بھی منطبق فرمایا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں "آیت مذکورہ میں ان نفوس فاضلہ کے ساتھ قسمیں ذکر کی گئی ہیں جو موت کی دہرے سے ابدان سے بزور انگٹ کیے جاتے ہیں کیونکہ بدن سے الفت و محبت کی دہرے سے ان کی جھڑائی

لَهُ" وَالنَّازِعَاتُ غُرُقًا" کی تفسیر جو آپ نے روح المعانی کے حوالہ سے ہمیشہ فرمائی ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کے خلاف ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؓ سب نے یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں نہ کہ نفوس فاضلہ۔ اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ کنز الایمان کے حاشیہ نویس جناب نفیم الدین صاحب مراد آبادی نے بھی یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں کیونکہ فرشتے ہی جسم میں ڈوب کر جان کو کھینچ نکالتے ہیں اور مدبراتِ امر بھی فرشتے ہی ہیں۔ یہاں جناب محمد علی صاحب نے جن چند مفسرین کے نام روح المعانی کی تائید میں پیش فرماتے ہیں یہ سب تصوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں ہر وقت یہ فکر دامگیر ہوتی ہے کہ جہاں تک بن پڑے فوت شدہ اولیاء اللہ کا تصرف فی الامور بھی کسی طرح کتاب و سنت سے ثابت کیا جاتے۔ روح المعانی کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ آپ معانی کی روح کھینچ کر ایسی تفسیر بیان فرماتے ہیں۔ متصوفین حضرات ظاہری معانی کو پہنچ سمجھ کر بعینہ باطنی معانی کی دریافت میں اپنی کوششیں صرف کیا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جو تفسیر صاحب روح المعانی نے پیش فرمائی ہے آیا قرآن کریم کے الفاظ ان معانی کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟

بہت مشکل ہوتی ہے۔ جبکہ بدن اعمال خیر میں ان کے لیے بمنزلہ سواہی کے ہوتا ہے اور بدن میں رہنا مزید خیر و برکت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تب وہ بدنوں سے جدائی کے بعد عالم ملکوت کی طرف بصد شوق گامزن ہوتے ہیں اور عالم ملکوت میں

صاحب روح المعانی کے مطابق آیات نمبر (۱) اور (۲) کے معنی یا تفسیر یہ ہے:

”وَالْتَرَعَلْتَ غَرْقًا وَالتَّشَطَّطْتَ نَشَطًا“

”ان نفوس فاضلہ کی قسم جو موت کی وجہ سے بدن سے بزور الگ کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔“

اب دیکھتے درج بالا ترجمہ یا تشریح پر درج ذیل اعتراضات اور ہمتے ہیں۔

۱۔ ”نَزَعَ“ فعل متعدی بمعنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنا ہے؛ مفردات

”نَزَعَ“ بمعنی جان کنی کا وقت ہے اور غرق فعل لازم بمعنی کسی چیز کا ڈوبنا ہے۔

اب اگر یہاں نازعات اسم فاعل بمعنی کھینچنے والیاں (اردو محاورہ کی نسبت سے کھینچنے والے) سے مراد فرشتے لیے جائیں۔ تو آیت کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ فرشتے انسان کے جسم میں ڈوب کر اس کی روح کو نکالتے ہیں اور یہی بات کتاب و سنت سے بھی ثابت و مسلم ہے۔ لیکن اگر یہاں فرشتوں کے بجائے نفوس فاضلہ مراد لیے جائیں تو وہ تو پہلے ہی اپنے اجسام میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے کسی دوسری چیز میں ڈوبنے اور اس کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنے کی کیا تمک ہے؟

۲۔ قرآن نے نازعات اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ بمعنی کھینچنے والے یا والیاں۔ لیکن روح المعانی نے اس کا ترجمہ بصورت مفعول ”بدن سے بزور الگ کیے جاتے ہیں“ کیا ہے جو اگر اس کے لحاظ سے غلط ہے۔

۳۔ ”وَالْتَّشَطَّطْتَ نَشَطًا“ فرشتے تو انسان کے جسم کے بند بند اور جود جود سے جان نکال لاتے ہیں لیکن نفوس فاضلہ جو پہلے ہی جسم میں موجود ہوتے ہیں اور بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔ وہ کیسے بند بند کو کھول سکتے ہیں؟ کیا بدن سے اُلفت و محبت کا تقاضا یہی ہے

پرداز کرتے ہوئے بارگاہِ قدس میں سبقت لے جاتے ہیں، تب اپنے مرتبہ و درجہ اور قدرت و طاقت کی وجہ سے کارکنانِ قضا و قدر میں سے ہر جاتے ہیں۔ تفسیر روح المعانی ص ۲۴ جلد ۳ مطبوعہ تہران۔ علامہ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "لا یذبحی التوقف فی ان اللہ قد یکرم من شاء من اولیاءہ بعد الموت کما یکرمہ قبلہ بہا مشاوی فیہرئی سبحانہ المریض وینقذ الغریق وینصر علی العدو وینزل الغیث وکیت وکیت کوامتہ۔ روح المعانی جلد ۳ ص ۲۵۔

ترجمہ۔ اس امر میں توقف و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے اولیاء کو وصال کے بعد بھی کرامتوں سے نوازتا ہے، جیسا کہ حالت حیات میں پس بھی مریض کو ان کے ہاتھ پر بطور کرامت شفا بخشا ہے۔ کبھی کسی کو غرق ہونے

کہ وہ اس کے بند بند کو خود ہی کھولنا شروع کر دیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے "وَالنَّشْطُ نَشْطًا" کا ترجمہ یا تفسیر چھوڑ دی اور اس کے بجائے جو فقرہ درج فرمایا کہ "ان نفوس فاضلہ کو بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے جدائی بہت مشکل ہوتی ہے؟" یہ دراصل ان کی اپنی طرف سے پہلی آیت کی مزید تشریح و تفسیر ہے۔

۴۔ جن نفوس کو اپنے بدن سے اتنی الفت و محبت ہو وہ فاضلہ ہو کیسے سکتے ہیں؟ عام نفوس کو تو فی الواقعہ بدن سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن نفوس فاضلہ کو بدن سے ایسی محبت قطعاً نہیں ہوتی۔ یا پھر ایسے نفوس فاضلہ ہوتے ہی نہیں۔ ترجمہ میں نفوس فاضلہ کے اضافہ کے فوائد۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ اہل طریقت حضرات "قَالُوا بِرَبِّاتِ اَهْرًا" میں اپنے مزمومہ "اولیاء اللہ" کو شریک بنانا چاہتے ہیں۔ لہذا انہوں نے پہلی آیت کے نفوس فاضلہ کا لفظ شامل کر کے اس کے لیے بنیاد ہموار کرنا شروع کر دی۔ اور تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ "اس امر میں توقع و تردد کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے "اولیاء" کو مرنے کے بعد بھی کرامتوں

سے بچاتا ہے بھی دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے تو کبھی ان کے عرض کرنے پر بارش برساتا ہے وغیرہ

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ علامہ اسماعیل حقی۔ امام فخر الدین رازی قاضی ثناء اللہ دہلوی تہ صاحب تفسیر نظری نے بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر بیان کی ہے۔

ثبوت سماع موتی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے!

۱۔ سماع موتی کے باب میں قلیب بدر والی حدیث مشہور و معروف ہے۔

جو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان خطاب رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہؓ سے مروی ہے۔ ان کی روایات

بخاری مسلم شریف میں موجود ہیں۔

۲۔ ثبوت جو تینوں کی آہٹ کی آواز سنتا ہے۔ یہ حدیث بھی سماع موتی پر

سے نوازتا ہے جیسا کہ حالت حیات میں

سوچنے کی بات ہے کہ وفات نبویؐ کے وقت چار لاکھ کے قریب مسلمان

موجود تھے اور سو لاکھ توجہ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور یہ دو صحابہ کرامؓ

سلامت تک پھیلا ہوا ہے۔ اب ان چار لاکھ صحابہ کرامؓ سے پورے سو سال

کے عرصہ میں صرف بارہ کرامات مذکور ہیں۔ پھر ان بارہ میں سے بھی بعض روایات

ضعیف و مجروح ہیں۔ لیکن ہمارے ان اولیاء اللہؓ میں سے ہر ایک ولی کی

زندگی کرامات سے بھر پور ہوتی ہے۔ پھر مرنے کے بعد بھی ان کی کرامات سلسلہ

بدستور جاری رہتا ہے۔ تو کیا ان اولیاء اللہؓ کے نفوس صحابہ کرامؓ سے

بہت زیادہ فاصلہ ہیں جن کی کرامات اور تصرف فی الامور کا یہ عالم ہے۔!

۳۔ قلیب بدر اور مرزہ کے عجوتوں کی چاپ سننے والی احادیث!

یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور ان پر میں پہلے بھر پور بحث کر چکا ہوں۔

ان میں پہلی حدیث معجزہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ایک اضطراری امر

دلائل کرتی ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت برابر بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۳۔ اخرج الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرو و اخرج الحاکم وصححه والبیہقی عن ابو ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه وقف علی مصعب بن عمیر حین رجع من احد فوقف علیہ وعلی اصحابہ فقال اشهد انکم احياء عند اللہ فزوروه وسلموا علیہم فوالذی نفسی بیدہ لا یسلم علیہم احد الا ردوا علیہ الی یوم القیامۃ

(شرح الصدور ص ۸۵)

ترجمہ۔ طبرانی نے اوسط میں بعد اللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور حاکم و بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب احد سے مراجعت فرما ہوئے تو حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے مزارات پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہو۔ پھر اپنے اہل بیتوں صحابہ کرام اور بعد میں آنے والوں کو حکم فرمایا کہ ان شہداء کرام کی زیارت کرو اور

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی کثیر تعداد ان حدیثوں کو جاننے کے باوجود علی الاطلاق سماع موثق کی منکر ہے۔

۴۔ طبرانی، حاکم اور بیہقی تیسرے درجہ کی کتب احادیث ہیں، طبرانی، حاکم اور بیہقی تینوں کتابیں تیسرے درجہ کی ہیں۔ ان سے اگر حواشیات ہو بھی جائے تو قابل احتجاج نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بالوضاحت لکھ چکا ہوں۔ کہ احادیث میں سے تیسرے اور چوتھے درجے کی احادیث سماع کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ صحاح ستہ میں سے بخاری اور مسلم اول درجہ کی، باقی چار کتابیں درجہ دوم کی ہیں۔ اور ان کے علاوہ باقی تمام کتب احادیث درجہ سوم اور چہارم کی ہیں۔

ان پر سلام بھیجو، مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جو شخص نجی قیامت تک انہیں سلام دے گا یہ شہداء کرام اس کا جواب دیں گے۔

اس روایت سے شہداء کا زائرین کو ماننا سلام سنا، جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ جب شہداء میں یہ چیز ثابت ہو گئی تو اولیاء کاملین صدیقین اور انبیاء کرام میں بطریق اولیٰ ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ فضیلت میں شہداء تیسرے نمبر پر ہیں۔ کیا کیلا فی صاحب کونبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے بعد کھی اور کی شہادت بھی درکار ہے؟
سماع موفی اور صحابہ کرامؓ،

۴۔ روی ابن عبد البر بسند صحیح ما من احد یمر بقبر اخیه المؤمن کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا عرفہ ورد علیہ السلام صححہ عبد الحق ورواہ ابن عبد البر فی الاستذکار و التمهید عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ (شرح الصدور ص ۸۲، طحطاویؒ ص ۲۶۶)۔

ترجمہ۔ ابن عبد البر نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ کوئی شخص بھی جب اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جسے صاحب قبر دنیا میں جانتا تھا۔ پس سلام دیتا ہے تو صاحب قبر اسے پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اس روایت کو محدث عبد الحق نے صحیح کہا اور ابن عبد البر نے استدکار و تمہید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۵۲۲۔ یہ حدیث موضوع ہے۔

یہ حدیث جو شرح الصدور اور طحطاوی کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے موضوع ہے۔ اور اسے میں موضوع حدیث ۷۱ کے عنوان کے تحت ص ۵۴ اور ۵۵ پر زیر بحث لاچکا ہوں۔ اور محدث عبد الحق صاحب کے نزدیک تو ایسی روایات بہر حال صحیح ہی ہونی چاہئیں۔

۵۔ روی مسلم عن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال لا بنہ وهو فی سیاق الموت اذا انامت فلا تصبی ناحتہ ولا نار فاذا دفتمونی فشنو علی التراب شنائم اقیمو احوال قبری قدر ما ینحر جزو رو یقسم لجمہ حتی استانس بکم واعلم ما اذا اراجع بہ رسول ربی مشکوٰۃ شریف ص ۱۲۹ باب دفن المیت۔

ترجمہ: مسلم شریف میں حضرت عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ جب وہ قریب المرگ تھے انہوں نے اپنے بچے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا جب میں فوت ہو جاؤں تو کوئی نوہ کرنے والی عورت میرے ساتھ نہ چلے اور نہ آگ میرے ہمراہ لائی جائے (جیسا کہ رسم جاہلیت تھی) جب مجھے دفن کر چکو تو مجھ پر آہستہ آہستہ مٹی ڈالنا پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاسکتا ہے تاکہ میں تم سے انس حاصل کروں اور پورے وثوق کے ساتھ اپنے رب کے بھیجے ہوئے ملائکہ کو ان کے سوالوں کا جواب دے سکوں۔

۲۳ حدیث صحیح ہے لیکن استنباط غلط

یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر اس کا جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے، وہ درست نہیں۔ کیونکہ یہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا اپنا خیال اور تدبیر تھی۔ اور یہ ویسا ہی خیال اور تدبیر تھی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو تاکید کی تھی کہ جب مصر پہنچو تو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اس پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

”مَا كَانَ يُفْتَنُ عَنْهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسٍ يَعْقُوبُ قَضَاهَا“ (یوسف ۶۸)

”وہ تدبیر خدا کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوبؑ کے دل کی بس خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔“
(ترجمہ فتح محمد جالندھری)

حضرت عمرو بن العاص نے یہ وصیت اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرو کو کی اور حضرت عبداللہ نے اسے خلاف قرآن و سنت نہ سمجھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اہل قبور کا زائر کو جاننا پہچاننا اور انص حاصل کرنا مشہور و معروف تھا ورنہ ان کے صاحبزادے جو خود بھی ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ضرور کہتے کہ آپ تو وہاں بے جان لاش ہوں گے میرے وہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟

اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی مختلف کتب احادیث میں سماع موتی کی تائید روایات موجود ہیں۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سماع موتی حضرت ام المؤمنین کے انکارِ سماع پر ایک نظر)

مولانا کیلانی صاحب نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو بنیاد بنا کر مقتولین بدر اور سماع موتی پر دلالت کرنے والی تمام روایات کو مردود اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے اور ان کی روایت قبول کرنے کا سبب ان کا نفی بتایا ہے۔ موصوف کا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے استدلال چند وجوہ کی

تو جس طرح حضرت یعقوبؑ کی یہ تدبیر مشیت الہی کے مقابلہ میں بے اثر ہونے کے باوجود شریعت کے منافی نہ تھی۔ بالکل یہی صورت حضرت عمرو بن العاصؓ کی تدبیر کی ہے جو انہوں نے محض اپنی دجمنی کے واسطے بتلائی۔ یہ تدبیر بھی کتاب و سنت کے منافی نہیں تھی۔ تاہم یہ مطابق بھی نہ تھی۔ کیونکہ اگر مطابق ہوتی تو اکیلے حضرت عمرو بن العاصؓ کا کیا ذکر، بہت سے صحابہ کرام ایسی وصیتیں کر جاتے بلکہ خود حضور اکرمؐ نے ”لَقِنُوا مَوْتًا كَثًّا“ کا ارشاد فرمایا تھا، اسی طرح اس موانست کے لیے بھی کوئی ارشاد فرمادیتے۔

پھر یہ بات ملحوظِ خاطر ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ بات سکرابت موت کی بحرانی کیفیت میں کہی اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے بیٹے عبداللہؓ نے اس وصیت پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟

بنائے پر غلط ہے۔
 اول حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اپنے اجتہاد و استنباط پر
 مبنی ہے۔

دوم۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ ضابطہ و قاعدہ بیان فرمایا ہے
 کہ جس کو واقعہ کا مشاہدہ ہے اس کا قول راجح و مختار ہے مسلم شریف میں ہے
 کہ حضرت شریح ابن ہانی نے حضرت ام المؤمنین سے مسخ خفین کی مدت سے
 متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔

علیت ہا بن ابی طالب فاساء لہ کان یسا فر مع رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی روایۃ علیاً فانہ علم بذالک
 منی۔ مسلم جلد اول ص ۱۳۵

ترجمہ۔۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دریافت
 کر وہ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور دوسری
 روایت میں ہے کہ انہیں اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ علم ہے۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جس کو واقعہ کا علم زیادہ ہے اسی کا قول معتبر
 ہے اور اس کا علم دوسروں سے بہر حال زیادہ ہے جو موقع پر موجود ہو۔
 چونکہ بذریعہ صحابہ موقع کے گواہ ہیں اور خود آنحضرت کے سامنے تعجب
 کا اظہار کرنے حقیقت حال دریافت کرنے والے ہیں لہذا انہیں کا قول

۲۳ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سماع موتی سے انکار کی
 بنیاد، اجتہاد و استنباط؛

حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اگر آپ کے اپنے اجتہاد و استنباط
 پر مبنی ہے، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اپنے اجتہاد و استنباط ہی کی بنیاد پر
 سماع موتی کے قائل تھے۔ گویا وہاں بھی بات اجتہاد و استنباط ہی کی ہے؛
 ۲۵ موقع کے گواہ؛

چوہدری صاحب نے روح المعانی کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ ام المؤمنین
 حضرت عائشہ صدیقہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت
 موجود نہ تھیں۔

معتبر ہے۔

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی فرماتے ہیں "امام سہیلی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں لہذا ان کے علاوہ جو صحابہ کرام وہاں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہیں۔ ترجمہ جلد ۲۱ ص ۵۔

سوم۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت "کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مقتول اس کو سن رہے ہیں" کے جواب میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا "کہ یہ مردار جانتے ہیں کہ جو کچھ میں انہیں کہا کرتا تھا وہ سچی ہے۔ محدثین نے فرمایا کہ دونوں روایتوں میں مخالفت نہیں ان کے لیے علم ممکن ہے تو سماع بھی ممکن ہے۔ منکرین سماع حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ قلیب بدر پر تشریف لے گئے اختلاف ہے تو صرف اس میں کہ حضور علیہ السلام

لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی قلیب بدر کے واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھے۔ ان کو جنگ بدر اور جنگ احد دونوں مقتول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم ہستی کی بنا پر جہاد میں شرکت کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ انہیں پہلی مرتبہ جنگ خندق میں شمولیت کی اجازت ملی اور اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی (دائرة المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۲ ص ۸۸) یہ عنوان عبد اللہ بن عمرؓ

نص میں اجتہاد نہیں۔

پھر موقع کے گواہ "کے ضمن میں جو دھری صاحب نے جو حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے مثال پیش فرمائی ہے وہ قیاس مع الفارق ہے۔ رسول اللہ کا مسح علی الخنجر کی مدت بتلانا نص ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ جبکہ سماع موتی کا مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ چھٹی تو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اجتہاد دوسرے صحابہ کرامؓ کے اجتہاد سے مختلف تھا۔

نے صحابہ کرام کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کیا الفاظ فرمائے۔

پہارم۔ حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ پہلے سماع کی نفی فرمائی لیکن بعد میں رجوع کر لیا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”تحقیق ذکر کردہ است در مواہب لدنیہ کہ در مغازی محمد بن اسحاق باسناد جید و در سند امام احمد بن حنبل باسناد حسن از عائشہ رضی اللہ عنہا مثل حدیث عمر رضی اللہ عنہ آمدہ۔ پس گویا عائشہ (رضی اللہ عنہا) رجوع کو از

۲۶۔ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نہ تو حضرت عائشہؓ موقعہ پر موجود تھیں اور نہ عبد اللہ بن عمرؓ، تو اب یہیں لامحالہ قتادہ عن انس بن مالک عن ابی طلحہ کی روایت اور ان کے استنباط پر انحصار کرنا پڑے گا۔ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں رسول اللہ نے جو الفاظ بیان فرمائے تھے، وہ یہ ہیں:

”مَا أَتَيْتُمْ بِشَيْءٍ لِّمَا أَقُولُ مِنْهُنَّ“ (بخاری کتاب المغازی

باب قتل ابی جہل)

یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ مُردے بھی ایسے ہی سن رہے ہیں جیسے

تم سن رہے ہو۔

اور حضرت قتادہ کا یہ استنباط بھی سماع موتی کے سلسلہ میں چنداں مفید نہیں کیونکہ ان الفاظ سے واضح ہے کہ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

۲۷۔ سماع موتی کے انکار سے حضرت ام المؤمنینؓ کا رجوع؟

یہ عبدالحق محدث صاحب کا اپنا خیال ہے۔ کوئی حدیث تو درج نہیں فرمائی، بس چند کتابوں کے نام گوا دیے ہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا سماع موتی سے انکار تو بخاری سے ثابت ہو، لیکن رجوع مواہب لدنیہ اور مغازی محمد بن اسحاق جیسی کتابوں سے؟ — ہاں اگر وہ کوئی حدیث درج فرما دیتے تو مسند احمد بن حنبل کی طرف رجوع کیا جاسکتا تھا۔

الحکام سبب آنچہ ثابت شود نزد دوسے از روایت ثقات صحابہ کبار زیرا کہ فرمائی اللہ عنہا عامر بن عبد ربیع در آل قبیضہ و در شرح مسلم نیز مثل ایں مذکور شد۔
مدارج النبوت، اشعة المعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۴۲۲

باب سماع میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی آیات

۱۔ اخرج ابن ابی الدنيا في كتاب القبور عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما من رجل يزور قبر اخيه ويجلس عنده الا استأنس به وروى عليه حتى يقوم۔ شرح الصدور ص ۸۴

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں کوئی ایسا شخص جو کہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے مگر اسے اس کے ذریعہ انس اور راحت و سکون میسر آتا ہے۔ سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔ اور یہ سکون اس وقت تک حاصل رہتا ہے جب تک بیٹھا رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوگا تو یہ حالت ختم ہو جائے گی۔

۲۔ عن ابن ابی مليكة قال لما توفي عبد الرحمن بن ابی بكر رضي الله عنهما بالحبشي فحمل الى مكة فدفن بها فلما قدمت عائشة رضي الله عنها اتت قبر ابن ابی بكر فقالت ۛ وكنّا كنّا في جذية حقبته۔ من الدهر حتى قيل كن يتصدعا فلما تفرقنا كافي وما لكأ۔ لظول اجتماع لم نبت ليلة معاً۔ ثم قالت والله لو حضرتك ما دفنت الا حديث مت ولو شهدتك ما فرتك۔ رواه الترمذی

۲۸ ابن ابی الدنيا کی روایات،

ابن ابی الدنيا کے متعلق پہلے و مناحت ہو چکی ہے کہ اس کی روایات قابل اجتماع نہیں۔

مشکوٰۃ شریف (۱۴۹)

ترجمہ - ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ جب عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مقام جلثے میں فوت ہو گئے تو انہیں وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف منتقل کئے وہاں دفن کر دیا گیا۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر پر تشریف لائیں اور فرمایا: ہم جذیمہ کے دو صاحبوں کی طرح زمانہ کا ایک طویل حصہ اکٹھے رہے، حتیٰ کہ کہا گیا کہ یہ ہرگز جدا نہ ہوں گے اور جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں اور مالک باوجود عرصہ دراز تک اکٹھے رہنے کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رات بھی اکٹھے نہیں رہے تھے۔

پھر اپنے بھائی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، بخدا اگر میں اس وقت موجود ہوتی جبکہ آپ کا انتقال ہوا تھا تو آپ وہیں دفن کیے جاتے جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت حاضر ہوتی تو اب تیری زیارت نہ کرتی۔ شیخ عبدالحی محدث فرماتے ہیں کہ چونکہ انداز مطہرات کا بغیر کسی ضرورت و مجبوری کے اپنے گھروں سے نکلنا روا نہیں تھا، اس لیے فرمایا کہ میں اگر اس وقت الوداع کر لیتی تو اب زیارت نہ کرتی۔

حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا خطاب اور الوداع کہنے کے لیے قبر پر تشریف لے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت صدیقہ کے نزدیک بھی صاحب قبر کو زائر کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کے کلام کو سنتا ہے۔

۲۵ حضرت ام المؤمنینؓ کا اپنے بھائی سے خطاب:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کی قبر کی زیارت کی، جو ان کی عدم موجودگی میں دفن کیے گئے تھے۔ اور قبر پر جا کر تمیم کے دو شعر بھی پڑھے جو اس نے اپنے بھائی مالک کی وفات پر مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔ پھر یہ کہا کہ اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو تمہیں اسی جگہ دفن کرتی۔ جہاں تم فوت ہوئے تھے اور تمہاری موت کے وقت میں موجود ہوتی تو تمہاری قبر پر

ترمذی شریعت کی یہ روایت ابن ابی الدنیا کی روایت کی مؤید ہے۔
امام ترمذی کی صحیح روایت کے بعد یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ امام ابن ابی الدنیا
ضعیف محدث ہے۔ ویسے جب ذہن میں پہلے ہی ایک غلط معروضہ
قائم کر لیا جاتے پھر کوئی بھی روایت ہو وہ ضعیف ہوتی چلی جاتے گی۔
احمد، حاکم کی یہ روایت بھی ان روایات کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت كنت ادخل البيت
فاضع ثوبي واقول انما زوجي وابي فلما دفن عمر معهما ما
يجي نه آتي۔

اب دیکھیے ایسا خطاب تو لوگ اپنے مرنے ہوئے عزیزوں کو اکثر کیا
ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ سن نہیں رہے۔ اور
شاعر حضرات تو ہوا کو مخاطب کر کے اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی لگا
دیتے ہیں، صرف مخاطب کرنا تو بڑی آسان بات ہے۔ مثلاً اقبال کہتا ہے کہ
اے ہمالہ! اے فیصل کشور ہندوستان پوچھتا ہے تیری پیشانی کو جھکے آسمان
تو کیا اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمالہ پہاڑ بھی
میرا یہ خطاب سن رہا ہے؛ اس طرح کا طرز خطاب تو محض اپنے جذبات کے
اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسی باتوں کو عقیدہ کی بنیاد بنانا آخر کہاں تک درست
ہے؟ اگر آپ نے سماع موتی کو احادیث سے ثابت کرنا ہی تھا تو اس سے تو
وہ حدیث بدرجہا مفید تھی جس میں مسلمانوں کو قبرستان جا کر سلام دعا کہنے کی
تلقین کی گئی ہے۔ لیکن اس کا جواب بھی ہم اپنے مضمون میں دے چکے ہیں۔

۳۔ ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟

ترمذی کی اس روایت سے ابن ابی الدنیا ثقہ راوی کیسے بن گیا؟ ترمذی کی یہ
روایت ابن ابی ملیکہ کی ہے اور اس میں صرف خطاب ہی خطاب ہے۔ جبکہ
ابن ابی الدنیا کی روایت یوں ہے کہ مرنے سے صرف سنتے ہی نہیں، جواب
بھی دیتے ہیں۔ تو جب متن حدیث میں ہی اصولی اختلاف ہو تو ابن ابی الدنیا
کو کیسے معتبر راوی قرار دیا جاسکتا ہے؟

دخلت الا وانا مشدودة على ثيابي حياء من عمر مشكوة
 ص ۱۵۴، شرح الصدور ص ۸۴۔ ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
 عنہا فرماتی ہیں میں اپنے حجرۃ اقدس میں داخل موتی تھی جس میں رسول خدا علیہ السلام
 آرام فرما رہے تھے پردہ کا اہتمام نہ کرتی تھی اور دل میں کہتی تھی یہ تو میرے خاوند
 ہیں اور دوسرے میرے والد ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے
 تو بخدا میں بغیر اچھی طرح پردہ و حجاب کیے ہرگز داخل نہ ہوتی۔ حضرت عمر
 رضی اللہ عنہ سے حیا کرتے ہوئے۔

۳۔ فوت شدہ بزرگوں سے عورتوں کا پردہ؟

یہ روایت بھی کئی وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے مثلاً :-

۱۔ یہ روایت مشکوٰۃ باب زیارات القبور کی تفسیری فصل میں درج ہے اور مشکوٰۃ کی تفسیری
 فصل کی بیشتر روایات ناقابل احتجاج ہیں جیسا کہ میں اس کتاب کے ص ۴۲ پر تفصیل
 سے بیان کر چکا ہوں۔ یہ روایت صحاح میں کہیں مذکور نہیں۔ چوہدری صاحب نے خود
 بھی اس کا دوسرا حوالہ شرح الصدور سے دیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبور حضرت عائشہؓ کے حجرہ یا گھر میں
 ہی تھیں پھر حضرت عائشہؓ اپنے ہی گھر میں اور کہاں سے داخل ہوتی تھیں؟ آپؓ
 کا یہ گھر کوئی دو پارکنال کا بلکہ تو نہ تھا کہ قبور کی طرف آئیں تو پردہ فرمائیں اور وہاں
 سے جانا ہو تو پردہ اٹھالیں۔ آپؓ کے اس گھر کے تقریباً تہائی حصہ میں یہ قبور تھیں، باقی
 جگہ آپؓ کی رانش گاہ تھی۔ قبور کے ساتھ بیرونی دیوار تھی جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔
 ایک عبد اللہ بن عمرؓ ہی ایسے صحابی تھے جو کبھی کبھار حضرت عائشہؓ سے اذن لے کر گھر کے
 دروازہ سے آتے اور تینوں قبروں کے پاس کھڑے ہو کر سلام کہتے تھے جنسور اکرمؓ کی قبر
 مبارک کو اس طرح بند رکھنے کی وجہ آپؓ کا یہ فرمان تھا کہ ”میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنانا
 بلکہ دور و نزدیک جہاں کہیں بھی تم مجھ پر سلام پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔“
 اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اندازہ کر لیجئے کہ حضرت عائشہؓ کب ایسا سخت پردہ
 کرتی ہوں گی اور کب اٹھاتی ہوں گی؟ ایسا سخت پردہ کرنے سے کیا یہی بہتر نہ تھا کہ
 وہ حضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں دفن ہونے کی اجازت ہی نہ دیتیں؟

اس روایت سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا نظریہ اہل قبور سے متعلق واضح ہو گیا کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند روایات مردی ہیں جن سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے جیسے "میت کی ہڈی توڑنا ایسا جیسا سنگ زندہ شخص کی ہڈی توڑنا۔" (یہ سماع موتی ثابت ہو رہا ہے۔ ناقل) ان روایات کی کوششی میں جناب کیلانی صاحب کا یہ دعویٰ محض غلط ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کی منکر ہیں۔

۳۔ حضرت عائشہؓ تو سماع موتی کی بھی قائل نہ تھیں۔ اب یہ بعد از مرگ حضرت عمرؓ کے انھیں دیکھنے اور حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کا معاملہ تو اور بھی سخت ہے۔ پھر یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ اگر قبر پر منوں مٹی سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کو دیکھ سکتے ہوں تو معمولی کپڑے کا حجاب ایسی نظر کے لیے روک کیونکر بن سکتا ہے؟

۳۔ کیا حیات برزخ اور سماع موتی لازم و ملزوم ہیں؟

جو مدعی صاحب لے لکھا ہے کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حیات برزخ کا کون قائل نہیں؟ حیات برزخ سے انکار تو مذاہب و ثواب قبر کے انکار کے مترادف ہے۔ اور میں نے اپنے مضمون میں اس حیات برزخ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اس حیات برزخ سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فوت شدہ لوگ ہم اہل دنیا کی باتیں سنتے اور ان کا جواب بھی دیتے بلکہ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں؟

۳۔ سماع موتی یا احترام آدمیت؟ اب تک جو دھری صاحب نے حضرت عائشہؓ کی جو تین مرویات پیش فرمائیں ان میں سے پہلی ابن ابی الدنیا کی ہے جو ناقابل احتجاج ہے دوسری روایت، جس میں حضرت عائشہؓ کا اپنے بھائی کو خطاب مذکور ہے، کے "اوی ابن ابی ملیکہ" نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ خود۔ اس روایت کو خواہ مخواہ حضرت عائشہؓ کی مرویات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور تیسری روایت حضرت عمرؓ کی قبر سے حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کی ہے جس پر ابھی بحث ہوئی۔ اور یہی بات میں بہ تکرار ذکر کر چکا ہوں کہ موضوع،

مولانا جبریل الرحمن نے روح، عذاب، قبر، سماح موتی سے متعلق مضمون کی دوسری قسط میں ایک جگہ لکھا ہے "حیرت کی بات ہے کہ سماح موتی اور اسی طرح سلوک و تصوف حنفیوں اور بالخصوص بریلوی طبقہ میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہ سماح موتی کے مخالف تھے۔ اور آگے امام صاحب سے متعلق واقعہ درج کیا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے سماح موتی کے متعلق نفی میں کچھ بھی ثابت نہیں اور جو روایات امام موصوف سے منسوب مجروح اور ضعیف روایات ہی سماح موتی کے جواز کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ پھر ایسی روایات کو پیش کرنے کا فائدہ؟

اور اب سماح موتی کے جواز میں یہ چوتھی روایت پیش کر کے تو چودھری صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ع۔ جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی ہم بعد احترام چودھری صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ اس حدیث میں قابل ذکر بات احترام آدمیت ہے نہ کہ سماح موتی۔ احترام آدمیت یہ ہے کہ انسانی جسم انسان کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی ملکیت ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے جسم کو نہ نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے، نہ خودکشی کرنے کا۔

۲۔ صرف انسان کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اسے دردے وغیرہ چیر بھاڑ نہ کھائیں۔ اور کسی جاندار کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم نہیں۔ ۳۔ کوئی شخص بھی کسی انسانی لاش میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ خود مرنے والا بھی ایسی وصیت نہیں کر سکتا۔ مثلاً یعنی کسی انسانی لاش کے اعضاء کاٹنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے میت کی ہڈی توڑنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب اگر اس حدیث سے بھی چودھری صاحب سماح موتی ثابت کرنا چاہیں تو ایسی سینکڑوں حدیثیں آپ کو آدھ بھی مل سکتی ہیں اور ہم پڑ پہلے سے ایک نظر یہ قائم کرنے کی وجہ سے نہ مانتے "کا الزام بھی بدستور برقرار ہے گا۔

۳۲ امام ابو حنیفہ سے منسوب روایات:

روایات کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو میں نے ایک روایت درج کی تھی، لیکن اور بھی روایات ہیں۔ اب یہ روایات شاذ ہیں یا ناقابل اعتبار، اس کا

کی جاتی ہیں وہ شاذ اور ناقابل اعتبار ہیں۔
مسک دیوبند کے نامور عالم مولوی رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں امام اعظم
رحمۃ اللہ علیہ سے اس باب میں کچھ مخصوص نہیں اور وہ روایات جو کچھ
امام صاحب سے آئی ہیں، شاذ ہیں۔ فتاویٰ رشیدہ ص ۲۲

منکرین سماع کے امام اعظم اور سماع موتی

مولوی اسماعیل بن شاہ عبد الغنی بن شاہ دلی محدث دہلوی صراطِ مستقیم
۱۶۶ پر رقمطراز ہیں ترجمہ مید احمد بریلوی کو سلسلہ چشتیہ کی نسبت حاصل
ہونے کا بیان یہ ہے کہ ایک دن آپ حضرت خواجہ خواجگان خواجہ
قطب الدین کاکی قدس سرہ کے مزار منور پر حاضر ہوئے اور مراقبہ کر کے
بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں حضرت خواجہ کی روح پر فتوح سے ملاقات ہوئی اور
آنجناب نے سید صاحب پر بہت توجہ فرمائی اور اس توجہ کی وجہ سے
نسبت چشتیہ کے ابتداء نصیب ہو گئی۔

جناب منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں: ”ایک روز ارواح مقدس

فیصلہ توحفی حضرات ہی کریں جن کے لیے آپ کے اقوال بھی حجت ہیں۔ ہم نے
تو محض تائید کے طور پر یہ روایت درج کی تھی اور اس کا حوالہ حاضر خدمت ہے۔
دیکھیے (غرائب فی تحقیق المذاهب و تفہیم المسائل ص ۱۸۱ محمد بشیر الدین)

حیرت تو اس بات پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی ”مشہور“ روایات جو سماع موتی کے
حق میں ہوں وہ تو پیش نہیں کی جاتی اور جو روایات مشہور ہیں انھیں ”شاذ“ کہہ کر اپنے
آپ کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ کیا تحقیق کا یہی انداز ہوتا ہے؟ سماع موتی کے رد میں

ہدایہ کی یہ عبارت بھی قابل غور ہے:

وَكَذَلِكَ الْكَلَامُ وَالذُّخُولُ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنَ

الْكَلَامِ الْإِقْنَاعُ وَالْمَوْتُ يُنَافِيهِ (ہدایت ج ۱ ص ۴۸)

یعنی ”اسی طرح اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں تم سے نہ کلام کروں گا
نہ تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر مرنے کے بعد اس کی قبر کی زیارت کی

جناب غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی و حضرت بہاؤ الدین نقشبند
متوجہ حال سید صاحب ہونیں اور قریباً ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان
دونوں روحوں کے درمیان رہا ہر ایک روح ان دونوں روحوں میں سے
سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایام
تنازعہ کے دونوں روحوں کی بالاشتراك جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ تب
دونوں ارواح مقدسہ نے بالاشتراك آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک بہر تک نفس
نفیس محو توجہ قوی اور تاثیر زود آور فرمائی کہ اس ایک بہر میں نسبت ان دونوں
خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔ سوانح احمدی ۶۵-۶۴

یہ روایت صراطِ مستقیم میں بھی درج ہے۔

اب یہ معتمد تو کیلانی صاحب ہی حل فرمائیں گے کہ کیا سید صاحب پر
توجہ ڈالنا اتنا ہی ضروری تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے ارواح قدستہ اسراریم
ملینین اور اعلیٰ علیین کی نعمتیں اور بلند مقام چھوڑ کر ایک ماہ تک آپس میں
جھگڑتی رہیں۔

کیا کیلانی صاحب یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اگر اَمَنَاتِ غَیْرِ احیاء
اور وَہمِ عَن دُعَائِهِمْ خَفِلُوْنَ کا اطلاق صرف فوت شدہ بزرگوں پر
ہی ہوتا ہے تو سید احمد بریلوی مزار خواجہ قطب الدین علیہ الرحمۃ پر کیا لینے

یا کلام کیا تو قسم نہ ٹوٹے گی کیونکہ کلام سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے اور

موت اس (افہام) سے روک دیتی ہے!

۳۵ معتمد کس کے لیے؟

جو حضرات عالم بھی ہوں اور طریقت و سلوک میں بھی ان کا دامن اُلجا
ہوا ہو، ان کے ذہنی انتشار کی بھی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب
محدث دہلوی، سید اسماعیل شہید، ابن حجر مکی وغیرہم سب اسی قبیل سے
ہیں۔ اب ایک طرف شاہ ولی اللہ کی کتاب "البلدغ المبین" دیکھیے۔ اور
دوسری طرف "انفاس العارفین" اسی طرح شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان"
دیکھیے پھر صراطِ مستقیم، آپ کو یہ یقین ہی نہ آئے گا کہ یہ ہر دو کتب ایک ہی

کہتے تھے۔ اگر پکارنے والے کی پکار کی خبر نہیں ہوتی تو وہاں سید صاحب کی ملاقات کس سے ہوتی تھی۔ اگر انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو شاہ نقشبند کو بخارا میں اور شاہ جیلان کو بغداد میں کیسے خبر ہوتی کہ ہندوستان میں کوئی سید احمد بریلوی نامی بھی شخص ہے چل کر اس پر تو خبر ڈالی جاتے جس کی تشہیر زعم خود توحید پرستوں کے امام ازل مولوی اسماعیل صاحب دہلوی نے صراط مستقیم میں کی ہے۔

آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ محدث جو کہ کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے تصویر کا دوسرا رخ شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا تاکہ ”محدث“ کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو

خود پرکھ سکیں۔

مخلص۔ چوہدری محمد علی حنفی

مُصَنَّف کی لکھی ہوئی ہیں۔ دونوں کتابوں میں ایک دوسری کا مکمل وجود ہوتا ہے۔ اگر آپ نے صراطِ مستقیم ملاحظہ فرماتی ہے تو تقویۃ الایمان بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارے لیے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی حجت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کو بھی پرکھنے کا معیار یہی ہے کہ انہیں کتاب و سنت پر پیش کیا جائے اور اُحْذَ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَذَرَ، کے اصول پر عمل کیا جائے۔

رہی یہ بات کہ سید احمد شہید کو حشلیہ نسبت کیسے حاصل ہوئی اذقادیہ کیسے؟ آخر سید احمد میں کوئی خوبی تھی کہ بغداد سے پیران پیر کی رُوح توجہ ڈالنے کے لیے آگئی اور دوسری طرف سے قطب الدین بختیار کاظمی کی رُوح تشریف لائی، پھر ان روحوں میں ایک ماہ تک تنازعہ ہوتا رہا۔ بالآخر سمجھوتہ کی صورت میں صلح ہو گئی اور سید احمد کو دونوں نسبتیں حاصل ہو گئیں۔ وغیرہ وغیرہ..... اگر ہم ان واقعات کو درست سمجھتے ہوں تو پھر تو معتمد بھی سمجھیں ورنہ یہ معتمد کیسا اور ان کو حل کرنے کے ہم مکلف کیونکر؟ ایسے کشفی واقعات و حالات کی حیثیت خواب کی سی ہوتی ہے جنہیں اہل طریقت و سلوک خود بھی حجت تسلیم نہیں کرتے!

(عبد الرحمن کیلانی)

